کی اس ضخیم کتاب مین ہندوستان نے مسلمان سلاطین خصوصاً تیموریون اور راجگان ہند کے تعلقات کے متعلق مختلف واقعات وحالات، اور اس دور کے دوسرے متفرق معلومات تو کافی ہین، اور اس کے حواشی وتعلیقات بھی قابل قدر ہین، لیکن اُن کو اصل موضوع سے بہت کم علاقہ ہے، اور یہ حصہ گویا اس کی صرف تمہید ہے، غالبًا کتاب کے دوسرے حصہ مین اس پر بحث ہوگی، تاہم یہ کتاب اس دور کے متعلق مختلف النوع معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے، اور کہن سال مصنف کے قلمی تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، موضوع کی دلکشی کے اثر سے جابجا مصنف کے قلم مین جوانی کی رنگینی اور چمک آگئی ہے،

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط | از جناب محمد معین الدین صاحب دردائی، ایم اے علیگ، تقطیع اوسط، ضخامت ۸۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت مجلد عہ، پتہ طیب حسن اینڈ برادرس، اسلامیہ بک ڈپو، آرہ،

مذکورہ بالا کتاب مین مصنف نے تاریخی علمی، اور لسانی حیثیت سے ہندی کے مقابلہ مین اردو کی اہمیت، اور لسانی اور صوتی، اور کتابت و طباعت کی سہولتون کے لحاظ سے اردو رسم الخط کی خصوصیات اور اس کی آسانیان دکھائی ہین، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اس کے جوابات دئے ہین، اور دیوناگری رسم الخط کے نقائص اور اس کی دشواریان ظاہر کی ہین، لیکن راج ہٹ کے مقابلہ مین اس قسم کے سارے سنجیدہ دلائل اور بحثیں بے کار ہین، اردو کا سب سے بڑا عیب اور قصور یہ ہے کہ وہ مسلمانون کے دور حکومت کی پیداوار ہے، اور اس مین اسلامی اثرات بھی ہین، اور ہندی اور سنسکرت خالص ہندوؤن کی قدیم زبان اور اسلامی اثرات سے بالکل پاک ہین، اس کے بعد اور کسی دلیل کی ضرورت ہی نہین رہجاتی،

"م"

جلد ۶۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۸ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

ہم گذشتہ مہینہ مین پاکستان مین اردو کے مسئلہ پر اپنے تفصیلی خیالات ظاہر کرچکے ہین، تازہ خبرون سے یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ وہان کی سرکاری زبان اردو ہوگی، یہ دانشمندانہ فیصلہ ہر لحاظ سے پاکستان کے لئے مفید ہوگا، لاہور کی اردو کانفرنس مین بھی اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے مناسب تجویزین پاس ہوئین، ان پر عمل کی بھی امید ہے، لیکن پاکستان کے اس فیصلہ سے ہندوستان مین اردو کے مسئلہ کا حل نہین ہوتا، جس سے کوئی ہوا خواہ اردو دست بردار نہین ہوسکتا، اس کے لئے برابر کوشش جاری رہنا چاہئے، گو جبری اور مصنوعی طریقہ سے نہ کوئی زبان پیدا کیجا سکتی ہے اور نہ مٹائی جاسکتی ہے، اس لئے اردو کا مٹنا آسان نہین ہے، لیکن اس سے بھی نہین انکار کیا جاسکتا، کہ زبان کی ترقی و تنزل مین حکومت کی حمایت اور مخالفت کو بڑا دخل ہے، خصوصاً ایسی حالت مین جب اس کو قومی مسئلہ بنادیا جائے،

زبان کا مسئلہ خالص لسانی اور تمدنی تھا، اس کو محض اغراض کی بنا پر سیاسی بنا دیا گیا ہے، چنانچہ آج بھی ہندون کی خاصی تعداد بجا طور پر اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی، اور اس کا برملا اعتراف کرتی ہے، حتی کہ وہ منصف مزاج اور ذمہ دار ہندو بھی جن کی مادری زبان اردو نہین ہے اسی کو ہندوستان کی مشترک زبان سمجھتے ہین، اور جبری زبان سازی کو پسند نہین کرتے، حال ہی مین مرکزی اسمبلی کے صدر مسٹر ماولنکر نے جن کی مادری زبان غالباً گجراتی ہے بنارس کی تقریر مین زبان کے بارہ مین جو خیالات ظاہر کئے ہین، وہ مخالفین اردو کے لئے لائق غور ہین، اُن کے نزدیک:۔

"اردو ہندی کا جھگڑا محض سیاسی ہے، اگر تعصب کو ترک کرکے صرف لسانی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے تو بہت سی غلطیان دور ہوجائین، محض نام کا پابند ہونا حماقت ہے، بعض نام محض اس لئے رکھے گئے ہین کہ اختلاف پیدا ہو،

ہندوستان کی زبان کے لئے ہندوستانی نہایت موزون نام ہے، جب پہلی مرتبہ اسمبلی مین مادری زبان مین تقریر کرنے کی اجازت دی گئی تو مقررون نے اردو اور ہندی کی تقریرون مین فارسی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار کردی، لیکن یہ جوش اب ختم ہوگیا ہے، ایک مشترک زبان کی بنیاد عصبیت اور اکل کھرے پن پر نہین رکھی جاسکتی" (پانیر، ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء)

اس تقریر مین جس زبان کو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی وہ زبان جس مین فارسی عربی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت نہ ہو وہی روزمرہ کی اردو ہے، محض نام کا اختلاف تو کوئی اختلاف ہی نہین تھا، اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھ لینے پر تو کسی کو بھی اعتراض نہین ہوسکتا، لیکن یہان تو مقصد ہی کچھ اور ہے جس کا ثبوت ہر عمل سے مل رہا ہے، بہرحال مسٹر ماولنکر کے ان خیالات سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن جب اصحاب اقتدار کو اس پر غور کرنے کی توفیق ہو،

یہ عجیب تضاد ہے کہ زبان سے تو اردو کی مخالفت سے برأت ظاہر کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اردو کو بھی ترقی کے مواقع حاصل ہین، لیکن عمل یہ ہے کہ اس کو سرکاری دفاتر سے خارج کیا جارہا ہے، اس کی تعلیمی حیثیت گھٹائی جارہی ہے، اور وہ تمام صورتین اختیار کی جارہی ہین، جس سے اردو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے، صوبہ کی اسمبلی مین بہت سی تقریرین ایسی زبان مین ہوتی ہین، جن کو مسلمان نہین سمجھ سکتے، اور اگر ٹوکا جاتا ہے، تو ابروے تمکنت پر بل پڑجاتے ہین، معلوم نہین یہ جمہوریت اور قومیت کی کونسی قسم ہے، ہم ہندی کے مخالف نہین، مسلمانون کو ضرور ہندی پڑھنی چاہئے، اُن مین اتنی مہارت پیدا کرنی چاہئے کہ ان مین پھر امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخانان اور میر عبدالجلیل بلگرامی جیسے ہندی کے قادرالکلام شاعر پیدا ہون، لیکن ہندی کو ہندی ہی رکھا جائے، سنسکرت نہ بنایا جائے، جسے ہندو بھی نہ سمجھ سکین، اردو کے ساتھ دشمنی نہ برتی جائے، اور اوس کو اوس کے واجبی حق سے محروم نہ کیا جائے، اگر ہندوستانیون مین قومیت کا صحیح احساس پیدا کرنا ہے، تو حکومت کو ایک نہ ایک دن زبان کے بارہ مین اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا، مشترک زبان کے بغیر ہندوستانی قومیت کی تعمیر نہین ہوسکتی،

یہ بڑے افسوس کا مقام ہو کہ ان حالات مین جب کہ پہلے سے کہین زیادہ اردو کی خدمت کی ضرورت ہو دلی کے گذشتہ ہنگامہ مین اردو کے ممتاز ادارون انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنفین کو جس نے اپنی تھوڑی سی عمر مین علم و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہین، بڑا نقصان پہنچا مکتبہ جامعہ بھی برباد ہوگیا ہم کو ان کے مخلص رکنون سے توقع ہے کہ وہ ہمت کر اس صدمہ کو برداشت کرین گے، اور اُن کے کامون پر اس کا مستقل اثر نہ پڑنے پائے گا، اور انجمن ترقی اردو اپنی مہم جاری رکھے گی، اس وقت اس کی جد وجہد کی بڑی ضرورت ہے،

مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا سید فضل اللہ صاحب استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت علم کے ساتھ صلاح و تقوی کے زیور سے بھی آراستہ فرمایا ہے، امام بخاری کی ادب المفرد کی عربی مین شرح لکھی ہے، اور ازراہ حسن ظن اس کا مقدمہ اور بعض اجزار راقم کو بھی مطالعہ اور اظہار رائے کے لئے مرحمت فرمائے ہین، مین اس کا اہل نہیں، اس کے بارہ مین صحیح رائے تو اصحاب فن محدثین ہی دے سکتے ہین لیکن مین نے تعمیلِ ارشاد مین جابجا سے اس کو پڑھا، اور اپنی محدود نظر کے مطابق یہ کہنے مین تامل نہین کہ مولانا نے محنت اور تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے، احادیث کی شرح اُن کے مشکلات کا حل، اجمال کی تفصیل، احادیث کی تخریج، روایات کی تحقیق و تنقید مسائل کا استنباط وغیرہ ہر پہلو فاضل مصنف کی وسعت علم، دقت نظر تفقہ اور اجتہاد و فکر کا شاہد ہے، احادیث کی شرح مین جابجا حافظ ابن حجر اور ابن دقیق العید کی نکتہ سنجی کی جھلک آجاتی ہے، اور کہین کہین پر استدلال کے ساتھ قدمار کی رائے سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، زبان سلیس شگفتہ اور ادیبانہ ہے۔

اس زمانہ مین جب کہ ہندوستان مین فنِ حدیث کا ذوق گھٹتا جاتا ہے فاضل مصنف کی یہ دینی و علمی خدمت بڑی قابلِ قدر اور لائق ستائش ہے، اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر دے، مولانا اپنے خرچ سے اس کو مصر مین چھپوا بھی رہے ہین کتاب کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ علمی و مذہبی ادارے اور علم دوست اصحاب ثروت اس کی طبع و اشاعت کی خدمت انجام دیتے، حیدرآباد مین جہان ایسے ادارون اور قدردانون کی کمی نہین، اس کا سامان ہوجانا کچھ مشکل نہین ہے،

مقالات

تجدید تعلیم

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

(۲)

علما پر اعتراضات کی تحقیق

آگے کچھ ان سطحی اعتراضات پر گفتگو ہے، جو بالعموم مولویون اور عربی پڑھنے والون پر دنیا دارون کی طرف سے کئے جاتے ہین، مثلاً یہ کہ مولوی ہو کر پست خیالی، کم ہمتی، ذلت پسندی، تنگ چشمی، دنائت، نیز قوتِ انتظامیہ کی کمی، وغیرہ صفاتِ رذیلہ پیدا ہوجاتی ہین، اور اس لئے اپنی اولاد کے لئے مولویت کو پسند نہین کرتے، ان الزامات مین جتنی واقعیت ہے اس کا اور اس کے واقعی اسباب کا ذکر تو آگے آتا ہے، پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ زیادہ تر ان کی بنیاد برعکس نہند نام زنگی کافور پر ہے، کہ لوگ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہنے اور سمجھنے لگے ہین یعنی دنیا دارون نے

"دنیا مین مالی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور اس ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو جو قناعت ہے کم ہمتی اور اخلاق مین جاہ و کبر حاصل نہ کرنے کو اور وضع مین سادگی اختیار کرنے کو ذلت پسندی اور اپنے پرائے کے حقوق کے امتیاز کو تنگ چشمی اور اسراف نہ کرنے کو دنائت اور دنیوی فضولیات مین انہماک نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح مین فروگذاشت کو قوتِ انتظامیہ کی کمی کا نام رکھ لیا ہے"

سوا کثر اہلِ علم مین ان امور کا ہونا مسلم مگر یہ رذائل ہین یا بخلاف دنیا دارون کے زعم کے فضائل،
تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کے لئے قرآن مجید و حدیث کافی ہے؛

"قرآن مین ہے، کہ زُیِّنَ للناس حبّ الشہوات مِنَ النسآء والبنین والقناطیر
المقنطرۃ مِنَ الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث
ذلک متاع الدنیا واللہ عندہٗ حسن المآب ۰ الذین ضلّ سعیہم
فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انہم یحسنون صُنعا انّ اللہ لا یحبّ
کل مختال فخور ۰ عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبہم
الجاھلون قالوا سلاما، لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، انّ المبذرین
کانوا اخوان الشیاطین وغیرہ آیات اور اُن کے علاوہ حدیث کی کثیر روایات مین غور کیجئے
تو معلوم ہو گا، کہ صفات مذکورہ جو اہلِ علم مین پائے جاتے ہین، آیا رذائل ہین، یا فضائل، اُن
معترضین نے ان کا نام رذائل رکھ کر اُن کے مقابل مین جو فضائل ٹھہرائے ہین، نصوص مین
اُن پر وعیدین وارد ہین، اور شریعت مین اُن کے نام یہ ہین، حرص، طولِ امل، کبر، عجب
اتلافِ حقوق، اسراف و تبذیر، حبِّ دنیا، غفلت من الآخرہ،

شریعت سے قطع نظر اخلاقی اعتبار سے بھی حرص وغیرہ کا شمار اخلاقِ ذمیمہ ہی مین ہے؛

اب ان صفات کو بھی سُن لیجئے، جو علوم دین نہونے سے پیدا ہوتی ہین، اور اس حالت مین
اور زیادہ پیدا ہوتی ہین، جب کہ علوم دین نہ ہونے کے ساتھ دوسرے علوم باطلہ یا صحبت
اہلِ باطل نے بھی اثر کیا ہو، اُن کے عنوانات یہ ہین :-

قارونیت، فرعونیت، ظلم و حمق وجزیرہ جن کا حاصل بالفاظ دیگر وہی حرص و طول امل
وغیرہ ہے، تو اگر علمائے دین کو پست خیال ذلیل وغیرہ کہا جائے، تو اس سے زیادہ ضروری

کہ مقابل کی جماعت کو فرعون، و قارون کہا جائے،

اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنی لئے جائین یعنی پست خیالی، یہ کہ فقط اپنی تن پروری و شکم پروری
سے مطلب ہو، اور دوسرون کو نفع پہنچانے کا خیال نہ ہو، اور کم ہمتی، یہ کہ مشقت سے گھبرائے
آرام کی فکر مین رہے، گو اس سے ضروری حقوق تلف ہونے لگین، اور ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر
مقدم رکھے، اور اس کی تحصیل مین غیرت و حیا کو طاق پر رکھدے، اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز
مین بخل کرے، شریعت و مروت کو چھوڑ دے، تعلقاتِ واجبہ کی پروا نہ کرے، اور دنائت ہی
جو حاصل ہے ذلت و تنگ چشمی کا، اور قوتِ انتظامیہ کی کمی یہ کہ اوقات کا پابند نہ ہو،
جن ضوابط و آداب معاشرت کے ساتھ دوسرے کے مصالح وابستہ ہون ان کے خلاف
کرے، جس سے اُن کی مصلحتین فوت ہون،

علما کی اخلاقی کمزوریان علم دین کا اثر نہین ہین

تو بلا شبہہ یہ اخلاقِ رذیلہ ہین، اور یہ بھی مسلم ہے، کہ بعض محصلین
علم مین یہ رذائل پائے بھی جاتے ہین لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم
دین کا خدانخواستہ اثر ہے، یا کسی اور چیز کا، اس کا فیصلہ اس طرح نہایت آسان ہے کہ
یہ اخلاقِ رذیلہ سب اہلِ علم مین پائے جاتے ہین، یا بعض مین پائے جاتے ہین، اور بعض مین نہین،
شق اُولی مشاہدہ سے غلط ہے، اور دوسری شق سے اتنا تو ثابت ہو گیا، کہ یہ علم دین کا
اثر نہین، ورنہ سب مین ہوتا،

تو ضرور یہ کسی دوسری چیز کا اثر ہے، جو میری تحقیق مین خاندان و صحبت کی کمی ہے، یعنی
بعضے خاندانی حیثیت سے پست و دنی ہوتے ہین، اب اگر صحبت بھی نصیب نہ ہو گی، تو
زی تعلیم کافی نہین، لا محالہ ان مین خاندانی رذائل موجود اور ظاہر ہوتے رہین گے، لیکن
ان کے مقابل مین ان اہلِ علم کو کیون نہین دیکھتے، جو عالی خاندان یا فطرۃً سلیم ہین، یا

صحبت نے اُن کو دُرست کر دیا ہے،

اور افسوس ہے کہ اس وقت عالی خاندان لوگون نے چونکہ سرتاپا انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھتے ہین، جو خاندانی طور پر دنی، دیہات مین رہنے کے سبب سے صحبت و تہذیب سے محروم ہوتے ہین، اور اس مین تبدیل کے اسباب جمع نہین ہوتے، تو لا محالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آئین گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے پھر بھی ان کو کسی قدر مہذب بنا دیا ہے، ورنہ اور زیادہ بے تہذیب ہوتے، اگر ایسی طبیعت کے لوگ انگریزی پڑھتے، تو اُن سے بھی زیادہ رذائل ان مین پائے جاتے،

زیادہ الزام معزز طبقہ پر ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس الزام کا زیادہ مورد معزز طبقہ ہے جس کے علم دین سے اعراض کی بدولت ادنی خاندان کے لوگ اہلِ علم مین زیادہ پائے جاتے ہین، جن کو دیکھ کر بقاعدہ للاکثر حکم الکل سب پر یہی گمان کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر خاندانی لوگ اپنی اولاد کو علوم دین مین کامل بناتے، تو ان مین کثرت سے علما پائے جاتے، اور بوجہ علو خاندان ان مین فضائل طبعیہ زیادہ ہوتے، اور رذائل مفقود ہوتے، تو جب اکثر علما ایسے نظر آتے، تو للاکثر حکم الکل کے قاعدہ سے عام طور پر علما، کو فضائلِ اخلاق کا جامع سمجھا جاتا، اور علم دین سے بدگمانی نہوتی، چنانچہ جو علما، خاندانی ہین خصوصًا جن کو اہلِ طریق کی صحبت میسر ہوگئی ان مین کسی کو پست خیال کم ہمت، تنگ چشم دکھائیے گو تنگدستی کے سبب سامان اُن کے پاس امیرانہ نہو پھر بھی اُن کی شان یہ ہے کہ ع

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

بلکہ مین دعوی کرتا ہون کہ بدونِ علم دین کے فضائلِ اخلاق و سیر چشمی و بلند نظری، عالی دماغی تہذیب اعتدالِ افعال و انتظام اقوال میسر ہونا ممکن نہین، چنانچہ بے علم امرا مین

ان اخلاق کا نام نہین ہوتا، لیکن مال کی بدولت خوشامدیون کا اجتماع رہتا ہے، اس لئے اُن کے عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے"،

مولوی سے مراد عالم باعمل ہے

سب سے بڑی اور آخری بات یہ ہے کہ مولوی سے مراد عالم باعمل ہے، جس کا نام چاہے، آپ درویش رکھ لیجئے، جو ایسا نہین، ہمارے نزدیک وہ مولویون مین داخل ہی نہین، ہم صرف عربی جاننے والے کو مولوی نہین کہتے، مصر و بیروت مین بہت سے عیسائی، و یہودی عربی دان ہین، (حتی کہ علوم اسلامیہ کے بڑے بڑے واقف ہین، مصر و بیروت کے علاوہ خود یورپ مین) تو کیا ہم اُن کو مقتدائے دین کہنے لگین گے"،

مثلاً اہلِ علم کی وضع و لباس اکثر سادہ کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا کبھی پیوند لگا ہوا کبھی بند یا بٹن کھلا ہوا، دیکھا جاتا ہے، اس سے ان پر تذلل کا شبہہ کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ تواضع ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغنار اور تذلل کا احتیاج ہے، لباس و وضع کو اس مین دخل نہین، اگر کپڑے پرانے ہین، اور ہفت اقلیم کا بھی دست نگر نہین، تو وہ معزز ہے، اور اگر لباس و وضع نوابون کا سا ہے، ہزارون تنخواہ ہے، ہزارون روپیہ جائداد کی آمدنی ہے، سامان امیرانہ ہے، مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ مین کچھ اور مل جائے، فلان معاملے مین کچھ اور ہاتھ آجائے، تو ایسا شخص بالکل ذلیل ہے"،

ہمارے جدید تعلیم کے معززین اگر عزت و ذلت کے اس صحیح معیار کو پیشِ نظر رکھ کر خود اپنی عزت کا کچھ مشاہدہ فرمائین، تو انشاء اللہ پھر دین کی تعلیم والون پر ذلت کی نگاہ ڈالنے یا اپنی ارجمندی کے مقابلہ مین ان کو پست ہمت کہنے کی ہمت نہ ہوگی،

پھر اگر عالم دین واقعی عالم دین ہے، تو اس کو اپنے دینی و علمی مشاغل نماز روزہ تہجد و تلاوت

درس وتدریس، تعلیم وتبلیغ وغیرہ مین انہماک سے خود اپنے بناؤ وسنگار کی طرف توجہ کیسے ہوسکتی ہے، کہ
ہر وقت بالون کی دھج اور پتلون کی شکن پر نظر رکھ سکے،

"یہ شخص تو قومی انجن کا ڈرائیور ہے، ڈرائیور کو غسل اور صابون ملنے کی اور کوئلون کے
جھاڑنے کی فرصت کہان، اگر فسٹ اور سکنڈ کلاس کے متنعم اس پر اعتراض کرین تو
یہ نہ سمجھین کہ ہم ولایت اسی کی بدولت پہنچے ہین، اور وہان سے ڈگریان حاصل کرکے فسٹ و
سکنڈ مین سفر کررہے ہین، تو نادانی کے سوا کیا ہے"

اور علوم دین پر کیا موقوف علوم دنیا کے جو سچے اور پکے، طالب ہوتے ہین، وہ بھی اپنی دھن
مین لگے رہتے ہین، عورتون کی طرح بناؤ سنگار کی فرصت نہین رکھتے،

تعصب اور غصہ کا اعتراض

کچھ اس طرح کے اعتراضات بھی غریب مولویون پر کئے جاتے ہین، کہ یہ کسی
سوال کا جواب نہ بن پڑنے پر یا غلبۂ تعصب سے غصہ کرنے لگتے ہین، اپنی بات رٹے جاتے ہین، دوسرون
کی سمجھنے کا قصد نہین کرتے، باہم حسد ونفسانیت کا زور اور ایک دوسرے کی برائی اور بدگوئی مین لگے رہتے ہین

"اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ انگریزی کے فاضلون مین یہ اخلاق بدرجہا زیادہ پائے
جاتے ہین، ذرا خلاف مزاج بات ہوجائے، غصہ سے بیخود ہوجاتے ہین، بات بات مین
کبر ونخوت پروری کا اظہار ہوتا ہے، تہذیب کی کمی کا یہ حال کہ جس کی طرف چاہا پشت کرلی،
جس کی طرف چاہا پاؤن جوتون سمیت پھیلا دئے، بزرگون کا ذرا ادب نہین، مان باپ تک
سے مساوات، بلکہ تحقیر کا معاملہ، اس سے زیادہ کیا بیحیائی ہوگی، کسی بڑے عہدہ کی
طلب میں خواہ تنخواہ نہ ملے، محض جاہ کے لئے ان کی حسد ونفسانیت، بلکہ تو تو مین مین
دیکھنے کے قابل ہوتی ہے؛

کالج یونیورسٹی تک کے نام نہاد علمی فضائل اور ان کی کمیٹیون وغیرہ کی بحث وگفتگو اور ان کے

آپس کے تعلقات مین حسد ونفسانیت کے جو مناظر چوتھائی صدی سے زیادہ راقم الحروف کے خود ذاتی
تجربہ ومشاہدہ مین آتے رہے، اُن سے نام کا یہ مولوی بھی اکثر شرما جاتا تھا،

"بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم مین ان اخلاق کا کوئی اثر ہو تو اس کا منشا اکثر دین
ہوتا ہے، اور ان اہل ترقی مین اس کا منشا دنیا ہوتی ہے، مثلاً مولویون کو دین کی
بات پر غصہ آوے گا، اور ان حضرات کو دنیا کی بات پر کیونکہ دین کی خود وقعت ہی ان
کے دل مین نہین، اس لئے اُن کو جوش بھی نہین آتا، لہٰذا انکو حلیم اور مولویون کو تندخو
قرار دیا ہے، یہی حال اور اعتراض کا بھی ہے، یہ تو الزامی جواب تھا،

اور حقیقی جواب یہ ہے کہ بالکل غلط ہے، کہ علما کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے، غصہ اگر
آتا ہے، تو اس پر کہ سوال ایک تو بطور استفادہ کے ہوتا ہے، اور وہ سوال بھی ضرورت کا ہو
اس پر تو مین دعوی کے ساتھ کہتا ہون کہ کوئی شخص کسی عالم کا ایک جگہ بھی غصہ نہین ثابت
کرسکتا، اور ایک سوال بطور تعنت یا تمسخر ومشغلہ یا محض اعتراض والزام کے لئے ہوتا ہے جو بکم
اس مین شریعت کی توہین ہوتی ہو تو جس کے دل مین شریعت کی عظمت ہوگی، وہ اس توہین
کو کب گوارا کرے گا اسی طرح بعض اوقات سوال مین مخاطب کی اہانت ہوتی ہو، اس کی
بھی ناگواری طبعی امر ہے، جو مذموم نہین، اسی طرح فضول یا اپنی فہم سے ماورا سوال کیا
اور سمجھانے سے سمجھ مین نہ آیا، تو بھی غصہ آجانا طبع سلیم کا مقتضا ہے، جو بجائے خود ایک
کمال ہے، چنانچہ سید الحکما والعلما حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود بعضے لایعنی سوالون
پر غصہ فرمانا کثیر حدیثون مین وارد ہے، کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے، یا عدالت
سے کچھ سوال کرے مثلاً ادنی سی بات ہے، کہ درخواست پر ٹکٹ لگانے کی نسبت پوچھنے
لگے کہ ایسا قانون کیون مرتب کیا، یا اس فیس سے نصف فیس کیون نہ مقرر ہوئی، تو کیا

توہین عدالت کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے، تو موجب غصہ نہ کہا جائے گا، کیا اس غصہ کو اخلاقِ رذیلہ مین داخل کیا جائے گا،

کیا مطلق غضب و تشدد کا شمار اخلاقِ رذیلہ مین ہے، اگر کسی کی عفیفہ ماں کے متعلق کوئی بباو شرارت سوال کرے، کہ سنا آپ کی والدہ ایک زمانہ مین چکلہ مین بیٹھا کرتی تھین، تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس کی تغلیط پر دلائل قائم کرے گا، یا اگر ایسا کیا تو شرفا اس کو بے غیرت قرار نہ دین گے، یا اگر وہ غضب و شدت سے کام لے تو عقلا کے نزدیک غیور و باحمیت ہوگا،"

یا اگر آپ کا سائیس درخواست کرے، کہ مجھ کو اقلیدس کی پانچوین شکل اس طرح سمجھا دیجئے کہ نہ اس مین اشکالِ سابقہ کا حوالہ ہو، نہ اصولِ موضوعہ و متعارفہ کا، تو کیا آپ سمجھانے بیٹھ جائین گے، یا فرمائین گے، کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے باہر ہے، پھر بھی اگر وہ اصرار کرے، تو کیا آپ اُس کو گدھا، احمق نہ کہنے لگین گے، اور کیا ایسا کہنے سے کوئی یہ کہے گا، کہ آپ کو جواب نہین آتا،

رہا تہذیب کا معاملہ اس کی نسبت کیسی دقیق و عمیق حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تہذیب کا معیار صرف مذہب صحیح ہوسکتا ہے، باقی آج کل،

"تہذیب کا معیار جو یورپ کا رسم و رواج سمجھ لیا گیا ہے، تو خود اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ہے کیا اہلِ یورپ کی کوئی رسم تہذیب سے گری ہوئی نہین، معیار دو ہی چیزین ہوسکتی ہین، عقلِ سلیم یا مذہب صحیح، مگر سلیم ہونے کے لئے پھر بھی کسی معیار کی ضرورت ہوگی، کیونکہ عقل متفاوت ہین، بس معیار ہونے کی صلاحیت صرف مذہب صحیح مین ہوسکتی ہے، جب تہذیب کا معیار مذہب صحیح اور دینِ الٰہی قرار دیا گیا، تو خلاف تہذیب

کا مصداق خلاف دین ہوا، تو اب دیکھ لیجئے، کہ دین کے خلاف علما مین زیادہ افعال پائے جاتے ہین، یا غیر علما مین اس سے معلوم ہو جائے گا، کہ بے تہذیب کون کہلانے کا مستحق زیادہ ہے،

باہمی اختلافات کا شبہہ

ایک شبہہ یہ ہے کہ مولویون مین اکثر مسئلون مین اختلاف ہوتا ہے، جس سے لوگون کو عمل کرنے مین سخت حیرت ہوتی ہے، کہ کس پر عمل کرین، جواب یہ ہے کہ کیا اطبا مین باہم تشخیص و تجویز مین اختلاف نہین ہوتا، اور کیا کوئی شخص اپنے مریض کو بلا علاج ہی چھوڑ دیتا ہے، کہ اختلاف کی حالت مین کس کا علاج کرین، تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دین، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہرِ فن ہے، اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہین، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے، اس مین ایسے اختلافات سنگ راہ نہین ہوتے، پھر کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہی ہے، اگر ایسا ہے تو چاہئے کہ عدالت مین جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو عدالت بجائے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمہ لے محض اس بنا پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہین، اور اختلاف مطلقاً مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا کر دیا کرین، کہ ایسے جرم اختلاف کے کیون مرتکب ہوئے، یا اگر سزا نہ کرے تو کم از کم مقدمہ کو خارج ہی کر دیا جائے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہلِ اختلاف مین سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونون کو محض اتفاق کا مشورہ دینا عظیم غلطی ہے بلکہ پہلے تحقیق کرکے معلوم کرین کہ کون حق پر اور کون باطل پر ہے، جو حق پر ہو، اس کی طرف ہو کر صاحبِ باطل کو مجبور کرین اور رائے دین کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہین،

فتوے مین مصلحت زمانہ کے لحاظ نہ کرنے کا اعتراض

ایک اعتراض یہ ہے کہ علما، اپنے فتاوی مین مصلحتِ زمانہ

کا لحاظ نہیں کرتے، وہی پرانے مسائل بتلاتے چلے جاتے ہین، زمانہ بدل گیا ہے اب علماء کو چاہیئے، کہ سود وغیرہ معاملات کو درست قرار دین، اس اعتراض کا باطل (بلکہ مہمل) ہونا ظاہر ہے، اس لئے کہ شریعت کے احکام اگر کسی بشر کے بنائے ہوے ہوتے تو اس احتمال کی گنجایش تھی، کہ اس کی نظر آیندہ مصالح پر نہ تھی، لیکن جب احکام شرع خدا تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہین، جس سے قیامت تک کے مصالح کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی مخفی نہین، تو یہ احتمال ہی کب ہے، کہ ان مین آیندہ کے مصالح کی رعایت نہین، بلکہ جس مصلحت کی اس مین رعایت نہین، وہ مصلحت ہی نہین"،

رہے اجتہادی احکام تو اجتہاد بھی مجتہد یا علماء اپنے دل سے نہین کرتے، وہ بھی کتاب وسنت ہی پر مبنی اور اس سے مستنبط ہوتے ہین، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قیاس مثبت نہین مظہر ہوتا ہے یعنی وہ خود کسی بات کو اپنی طرف سے ثابت نہین کرتا، بلکہ جو کچھ قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اسی کو ظاہر کر دیتا ہے، اور پھر قیاس بھی کیسے مجتہدین کا جن کا علم وفہم، تقوی وتدین ایسا غیر معمولی تھا، کہ کم از کم ہمارے مقابلہ مین ان سے خطا ولغزش کا بہت کم احتمال ہے، پھر اس خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہین، بلکہ اجر ہے، اس لئے کہ اگر اجتہاد کے شرائط کسی مین موجود ہین، اور اس نے ہر طرح تحقیق کا حق ادا کیا، تو ماجور ہوگا، اور اگر از راہ بشریت حق کے ادا کرنے پر بھی خطا کی تو معذور ہے،

گوشہ گیری کا اعتراض

ایک اعتراض مولویون پر یہ ہے کہ یہ اپنے گھرون مسجدون اور مدرسون مین بیٹھے رہتے ہین، قوم کی تباہی پر رحم نہین آتا، کہ گھرون سے نکل کر گمراہون کی دستگیری کرین، لوگ بگڑتے چلے جاتے ہین، کوئی اسلام چھوڑ رہا ہے، کوئی احکام سے بے خبر ہے"

تو اولاً تو مختلف ذرائع سے اسلام واحکام کی اتنی اشاعت ہو چکی ہے، کہ اب تبلیغ کے وجوب کا درجہ باقی نہین رہا، جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے، اگر اس کو اپنے اسلام اور دین کی کچھ بھی قدر

اور پروا ہو تو طرح طرح کی واہیات اور خرافات کتابین اخبارات و رسائل وغیرہ تک پڑھنے سننے مین وقت صرف کرتا، اور لڑائی بھڑائی مین دنیا بھر کی واہی تباہی خبرین معلوم کرنے مین لگا رہتا ہے، تو کیا دین کی کتابین اور رسالے نہین پڑھ اور سن سکتا، یا جاننے والون سے مسئلے مسائل نہین دریافت کر سکتا، اسی طرح غیر قومون نے کیا اسلام کا نام نہین سنا، اور اگر مذہب کوئی اہم معاملہ ہے، تو کیا وہ آسانی سے دو ایک رسالے پڑھ یا سن کر اتنا نہین معلوم کر سکتے، کہ اسلام ہے کیا، اور وہ اصولاً چاہتا اور کہتا کیا ہے،

اس کے علاوہ مسجدون اور مدرسون مین جو مولوی پڑے ہین، وہ بھی تو آخر کچھ نہ کچھ اپنی بساط بھر دین کی خدمت کر رہے ہین، تاہم تبلیغ اس مین شک نہین، کہ دین کی بہت بڑی، بلکہ سب سے بڑی اور اعلیٰ خدمت ہے لیکن

"کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علماء ہی کے ذمہ ہے، دنیادار اور مالدار مسلمانون کے ذمہ نہین کیا وہ اتنا نہین سمجھ سکتے کہ علماء کو معاش سے فراغ نہین، لہذا آپس مین سرمایہ جمع کر کے علماء کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دین، جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہرے پا رہے ہین، جابجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھرتے ہین،

"اور ہمارے معترضین کو علماء پر جو یہ اعتراض سوجھا وہ انھی مشنریون کی مساعی دیکھکر اور یہ اس وقت عام عادت ہو گئی ہے، کہ اصل حقیقت مین غور نہین کرتے بس غیرون کے رسم ورواج کو اپنا رہنما اور معیار استحسان قرار دے لیا ہے، حقیقت بینی سے قطع نظر یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علماء پر اُن کے علماء کے برابر سعی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے یہ بھی دیکھ لین، کہ آیا ہمارے دنیادار ان کے برابر اعانت مالی بھی کرتے ہین یا نہین"،

حالانکہ بیچارے ہمارے بدنام "مولوی" اب بھی اتنے قانع اور قلیل المصارف ہین کہ مشنریون سے

بہت کم پر گذر کر سکتے ہین لیکن اپنے بال بچون کے واجبات اور حقوق نفس کا ادا کرنا بھی تو شریعت ہی کا
حکم ہے، اور مستحب تبلیغ کے مقابلے میں واجب بلکہ واجب تبلیغ پر بھی مقدم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حقوق
زیادہ کس کا ہے، ؟ دنیا دارون اور مالدارون کا یا مولویون کا، غرض تبلیغ و اشاعت کا وجوب بھی
علماء کے ساتھ خاص نہین، سب مسلمانون پر اپنی وسعت و اہلیت کے بقدر واجب ہے"؛

تحریر و تقریر مین قصور کا شبہ

ایک شبہ عربی کے طالب علمون اور علماء پر یہ بھی کیا جاتا ہے
کہ یہ لوگ تقریر و تحریر مین قاصر رہتے ہین، تو یہ کلی حکم تو نہایت بے انصافی ہے، کیا علماء
و طلباء مین بہت سے ایسے بجد خوش تحریر و خوش تقریر نہین پائے جاتے جن کا مقابلہ دوسری
تعلیم کا بڑا سے بڑا فاضل بھی نہین کر سکتا"؛
البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ مین ضرور معلوم ہوتی ہے، کہ خوش تحریری و تقریری کی مشق
کا اہتمام بھی مدارس مین بالالتزام کیا جائے، اور طلباء کا اختیاری امر نہ رہے، بلکہ سب کو
اس امر پر مجبور کیا جائے"؛

شاید ندوہ والون کا خیال ہو کہ اس جدید ضرورت کا احساس پہلے پہل انھی کو ہوا، لیکن جامع المجددین
کی نظر کسی جدید ضرورت سے کیسے محجوب رہ سکتی تھی، یہ اور بات ہے کہ قدیم درسگاہون نے اس تجدید کے قبول
کرنے مین تاخیر کی، اور ندوہ کی تعجیل قابلِ تحسین ہے، لیکن وہان یہ استحسان اعتدال کی حد سے نکل کر
غیر مستحسن حد کو پہنچ گیا ہے، یعنی ندوی اب اپنا اصلی کمال انشا پردازی اور انشا نگاری ہی کو جاننے لگے
ہین، حتی کہ اس کے نیچے درسیات مین استعداد کی بھی پروا نہین کرتے، اور دوران طالب علمی مین عربی در
درسی کتابون سے زیادہ اردو کی انشا پردازانہ کتابون کی طلب و مطالعہ مین لگ جاتے ہین، ابھی آج
(۱۱ر جون سنہ) یہ سطرین لکھ ہی چکا تھا کہ روزنامہ تنویر مین طلباء ندوہ کی جمعیۃ الاصلاح کا یہ
کارنامہ چھپا ہوا پڑھا کہ "علمی و ادبی مجالس مین دلچسپی اور انشا پردازی اور تقاریر کی طرف اشتیاق زیادہ

پایا جاتا ہے، یہی نہین اور آگے اصلی ندویت یہ لیجئے کہ "جن حضرات نے زیادہ دلچسپی لی، اور ہمیشہ اپنی تقریرون سے
جلسہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، انھین کپ و مڈل دے کر ہمت افزائی کی گئی، غریب طلباء سے زیادہ
علماء ندوہ اور منتظمین ندوہ کو سوچنا چاہئے کہ اغیار کی اس نقالی کے سوا ہمت افزائی کا کیا اور کوئی طریقہ
نہین، اور اس نقالی کے مفاسد کہان تک جاتے ہین، اور غیرون کی تقلید و اتباع کی اس سے کتنی ہمت
افزائی ہوتی ہے، ہمارے مشہور خوش تحریر و خوش تقریر غیر ندوی فاضل اجل مولانا گیلانی نے تو اسی بنا پر ندوہ
کا نام "مدرسۃ الصحافۃ والخطابۃ" رکھ دیا ہے، اس کے علاوہ جن کو فطری مناسبت نہین ان کو مجبور کرنے اور مشق کرنے سے
بھی طوطے ہی بنے رہین گے، اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اندازہ کر لیا جائے، اور جن کو مناسبت نہ ہو، ان کو اپنا وقت
خراب نہ کرنے دیا جائے، جیسا کہ حضرت نے ہدایت فرمائی ہے، کہ "پھر بھی ایسے لوگ ثابت ہون گے جن کو فطری
طور پر تقریر و تحریر سے کم مناسبت ہوگی، سو ایسے لوگ اپنے عمل کیلئے علم حاصل کرین، دوسرون کے افادہ کے لئے
اور بہت سے لوگ مل سکین گے، یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کرے" (ص ۳۲)

علماء کی وقعت اور عظمت کی حفاظت نہایت اہم ہے

عربی و دینی تعلیم کے طلباء و علماء کو طرح طرح کے معقول و نامعقول صحیح و غلط اعتراضات
کا ہدف بنانا، خصوصاً نئے فیشن کے لوگون مین جو ایک فیشن بن گیا ہے، اس کی
طرف جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے جو اس قدر بلیغ توجہ فرمائی، اور راقم ہذا نے اس کے بیشتر حصہ کی تلخیص
ضروری جانی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تبلیغ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ مین حضرت کی نگاہ تجدید
مین دین کی حفاظت کے لئے علماء و فقہاء کی وقعت و عظمت کی حفاظت اہم و اقدم ہے،
اس لئے کہ سارے مسلمان سارے اسلامی علوم اور احکام و مسائل کے عالم و محقق نہ کبھی ہوئے ہین اور
نہ آیندہ ہون گے، لازماً اگر کوئی خاص جماعت "ولتکن منکم" کے تحت ہمیشہ اور ہر عہد مین نہ موجود رہے جو
مسلمین کو ایمان اور عمل صالح کے مختلف ابواب اور شعبون کے احکام آخر کون بتائے، اور کس سے معلوم کرین
یہی نہین بلکہ اگر خدانخواستہ علماء کی جماعت کسی عہد یا کسی نسل مین بالکلیہ ناپید ہو جائے، تو دین کا وجود ہی

خطرہ مین پڑ جائے، خالی کتابون اور کتبخانون سے دین ہرگز محفوظ نہین رہ سکتا، جب تک ان کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ مستمر نہ رہے، خوب یاد رہنا چاہئے، کہ زبانی یا درسی تعلیم و تعلم کا تسلسل و تواتر ٹوٹ جانے سے خالی کتاب سے ہر چیز کا صحیح سمجھ لینا بھی ممکن نہین، ایک عالم نفسیات خوب سمجھ سکتا ہے کہ کتابون کی فہم کی استعداد بھی زبانی تفہیم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے، شروح و حواشی بھی زبانی فہم و تفہیم سے مستغنی نہین بنا سکتے، کسی معمولی فن کو بھی جس نے استاذ سے نہین پڑھا ہے، محض کتابون سے بیسیون مقامات پر ٹھوکر کھائے گا،

غرض جب علماء کا وجود ایک طرف دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دوسری طرف اس کی بقاء و تحفظ کے لئے ناگزیر ہے، تو اگر امت کے اندر یہ جماعت خدا ناکردہ موجود نہ رہے، یا موجود ہو اور اس کی تنقیص و تحقیر و توہین جا بیجا الزامات سے دلون مین راسخ کر دیا جائے کہ لوگ ان سے بیزار ہو کر استفادہ نہ کرین، تو پھر علماً و تعلیماً اور بالآخر عملاً معاذ اللہ دین کے فنا ہو جانے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوگا، گو جس دین کی حفاظت خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو وہ فنا نہین کیا جا سکتا، لیکن کیا اس سے ہم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مواخذہ سے بری ہو جا سکتے ہین، حضرت کی کتابون اور مواعظ و ملفوظات وغیرہ سب مین کثرت سے اس پر تنبیہات موجود ہین، کہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنا، اور احکام دریافت کرتے رہنا ضروری ہے، بالکل اسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر جیسے ہر شخص یا ہر خاندان کسی طبیب سے عادۃً تعلق رکھتا ہے، اور چھوٹی بڑی بیماریون مین زیادہ تر اسی کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے، کیا روحانی صحت جسمانی صحت کے برابر بھی لائق التفات نہین، اگر قریب کوئی عالم نہین ہے، تو حضرت کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھے، اور خط و کتابت سے احکام معلوم کرتا رہے، اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہین اُن کی حفاظت و ترقی کی تاکید جا بجا فرمائی ہے، کیونکہ ہماری گاڑی کے انجن ڈرائیور یہین سے پیدا ہوتے ہین، اگر خدانخواستہ عربی درسگاہون سے اُن کی فراہمی منقطع ہو جائے تو

اور اُس کے فرسٹ و سکنڈ، متوسطین کے انٹر، وغیرہ بادعوام کے تھرڈ، سارے کے سارے ڈبے اپنی جگہ بے حرکت کھڑے رہ جائین، ہر طبقہ کی دینی حیات و حرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے بُرے بھلے علماء یا مولویون ہی کے دم سے قائم ہے، اور جس قدر اُمت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت و حیثیت کے موافق ہماری دینی گاڑی کے ان ڈرائیورون یا چلانیوالون کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت، خدمت و اعانت کا بند و بست کرین گے، اسی قدر ہماری دینی حرکت و حیات جاندار و پائدار ہوگی، اور اسی نسبت سے انشاء اللہ دنیا بھی درست ہوگی

علم دین کے حقوق طلباء و علماء پر

یہان تک ان حقوق علم پر گفتگو تھی، جو زیادہ تر عامۂ مسلمین کے ذمہ ہین، آگے باب دوم مین ایسے حقوقِ علم مین کوتاہیون اور اُن کی اصلاح کو بیان فرمایا گیا ہے جو خود علم دین کے طلباء و علماء پر ہین

"بعض طلباء یہ خیال کرتے ہین، کہ ابھی تو ہمارا تحصیل علم کا زمانہ ہے، اس مین عمل کی چندان ضرورت نہین، یہ سراسر شیطانی دھوکا ہے، نصوص نے وجوبِ احکام مین طلباء و علماء مین کہین فرق نہین کیا، البتہ اعمال زائدہ جیسے طویل اوراد یا مجاہدات و ریاضات کہ اُن مین مشغول ہونے سے طالب علم کے لئے مطالعہ اور تکرار سبق افضل ہے"،

بعض نام نہاد علماء علوم دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیتے ہین، خواہ طلبِ جاہ ہو، یا طلب مال لیکن اُن پر سب کو نہ قیاس کرنا چاہئے "کیا کوئی اناڑی عطائی آدمی خلافِ اصول طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دیکر ٹھگ لے، تو اس سے ملک کے تمام ماہرین اطباء کے کمال کی نفی جائز ہوگی"، بہر حال:-

"بعضے ایسا کرتے ہین کہ وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہین، اور اسی غرض سے وعظ کرتے پھرتے ہین، کہ کچھ وصول ہو، اور اس قسم کی وعیدون کو بھلا دیتے ہین، کہ مثلاً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ

من تعلم علماً مما يبتغى به وجه الله لا يتعلمه الا ليصيب به عرضاً من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيامة

جس نے اللہ تعالیٰ کے رضا جوئی کے علم کو دنیا کی کسی غرض سے سیکھا اس کو قیامت مین جنت کی بو بھی نصیب نہ ہوگی،

علم دین کے دینی و دنیوی استعمال مین فرق

البتہ جس طرح اوپر آیت للفقراء الذین احصروا کے تحت وعظ کی نوکری کا جائز ہونا معلوم ہو چکا، اسی طرح اگر اشاعت احکام، محض حسبۃً للہ ہو، اور لوگ کچھ خدمت کر دین جس کی قلب مین طمع نہ ہو، (گو احتمال وسوسہ ہو) تو وہ جائز ہے، اور اس کا امتحان یہ ہے کہ وعظ کے لئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے، اُن کو جہان روپیہ ملنے کی زیادہ اُمید ہے، یا اُن کو جہان تبلیغ احکام کی زیادہ ضرورت ہے، یہی امتحان علوم دینیہ کی تدریس کی نوکری کا ہے، کہ اگر تنخواہ پر نظر نہ ہوگی، تو جس صورت مین ایک جگہ پر گذر ہوتا ہو گا، اور وہان علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو، تو ایسی جگہ کو چھوڑ کر ترقی پر نہ جائے گا، اور نہ خود کوشش کر کے ایسی جگہ جانا چاہے گا، اور فقہا نے جو تعلیم علوم دینیہ اور وعظ پر اُجرت کی اجازت دی ہے، اس سے مراد یہی صورت ہے، ورنہ حنفیہ رحمہم اللہ طاعات مقصودہ پر اُجرت کو بوجہ نہی کے کسی طرح جائز نہین رکھتے،"

علما کا امرا سے اختلاط

بعض علما، امرا و اہل اموال سے اختلاط اسی غرض سے رکھتے ہین، کہ اُن سے وقتاً فوقتاً کچھ حاصل ہوتا رہے، اس مین گاہے یہان تک نوبت آتی ہے، کہ اُن کی غرض سے مسئلہ بتا دیتے یا بنا لیتے ہین، جس سے سردست تو وہ خوش ہو جاتے ہین لیکن بہت جلد ہی ایسے علما اُن کی نظر سے گر جاتے ہین،

پھر وہ اُن پر تمام علما کو قیاس کر کے جماعت کی جماعت سے نفور ہو جاتے ہین،"

باقی اگر اس اختلاط سے امرا کی اصلاح ہو، کہ اُن کو احکام دینیہ بتلائے جائین، خصوص جب کہ وہ خود خواہش کرین، اور اُن کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو، تو ایسا اختلاط نہ مضر ہے نہ موجب مذلت، مگر جب قرائن یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر کیا جا سکے گا، اور ایسی حالت مین اگر وہ کچھ خدمت کرین تو لینے مین کچھ مضائقہ نہین، مگر احقر کا مشورہ یہی ہے، کہ ہرگز قبول نہ کرے، بلکہ جانے کے قبل شرط کرے، کہ لینے دینے کا کچھ قصہ نہ ہو گا، جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت مین امرا کا حوصلہ نہین پڑتا، کہ علما کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل مین لائین، بلکہ ہر طرح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے، اور یہی امر قسم بالشان ہے اور اگر خود امرا آئین تو یہ اختلاط منع نہین بلکہ مطلوب ہے، اُن سے بے رُخی نہ کرے اخلاق سے پیش آئے مگر استغنا کو اب بھی ہاتھ سے نہ دے،

حیلہ شرعی کو حیلہ بنانا

بعض علما، کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری غنی بنایا ہے، اُن کو کسی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے کی نوبت نہین آتی، لیکن اپنے مالی معاملات مین ایسا کرتے ہین، کہ اگر شریعت پر عمل کرنے سے کوئی اُن کی مالی منفعت ضائع ہو رہی ہو تو ضعیف تاویلون اور غیر مشروط حیلون سے (گو نام اُن کا حیلہ شرعی رکھتے ہین) کام لیتے ہین، یہان تک کہ عام لوگون کے زبان زد ہو گیا ہے، کہ مولوی اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہتے ہین بنا لیتے ہین، میرے نزدیک اگر گناہ کر کے اپنے کو گنہگار سمجھے اور گناہ گار ہونے کا اقرار کرے تو اتنا مفسدہ نہین جتنا گناہ کو کھینچ تان کر جائز بنانے مین مفسدہ ہے، اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے علما سے بد اعتقاد ہوتے اور پھر اپنے معاملات مین تاویلین اور حیلے پوچھتے ہین، اور اگر کوئی نہین بتاتا تو قیاس فاسد سے خود ہی اپنی من سمجھوتی کر لیتے ہین،

عزت عوام کی حفاظت

علما کی شان تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو، مگر کسی وجہ

سے اوس کے ارتکاب مین عوام کی دینی مضرت ہو تو اپنا ضرر بقدر تحمل گوارا کرین لیکن عوام
کا دین بچائین، نہ کہ اُن کے لئے فتنہ کا دروازہ کھول دین لیکن اس سے تصحیح معاملات کی
ان وجوہ پر (گو اُن کو بھی بعض کتابون مین حیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے) کوئی شبہہ نہ کرے،
جن مین بلا کسی نفسانی غرض کے، عام مسلمانون کو تنگی سے نکالنے اور معاصی سے بچانے کیلئے
اذن دیا گیا ہے، جیسا کہ خود حدیث مین ہے، کہ بع الجمع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم جنیبا
الخ وغیرہ ہے، فرق دونون مین یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی شرعی مقصود کا ابطال ہو وہ
مذموم ہے اور جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کا حاصل کرنا ہو، وہ محمود ہے، مثلاً ربوا مقصود نہ ہو
بلکہ خود اجناس ہی قیمت مین متفاوت ہون لیکن اتحاد بدلین کے سبب تفاضل ممنوع ہو
وہان حدیث مذکور کے موافق تصحیح کر لینا جائز و مشروع ہے"،

علماء کی جاہ طلبی | یہ تو بصورتِ مال دنیا طلبی تھی، بصورتِ جاہ دنیا طلبی کی چند صورتین ملاحظہ ہون،

"بعض علماء اس لئے امرا سے ملتے ہین، کہ لوگون مین عزت و وقعت بڑھے گی، حالانکہ عام
مسلمان اس کو اہل علم کے لئے عیب سمجھتے ہین، واقع مین بھی علماء کی عزت و شان کے لئے
یہی مناسب ہے کہ دین کی خدمت کرین، امرا سے مستغنی رہین، غربا کے ساتھ خوش خلقی
کرین، اور امرا کی نظر مین تو اس سے اچھی خاصی ذلت ہوتی، ہے وہ سمجھتے ہین کہ خوشامد
کے لئے ملتے ہین، اور ایک اثر امرا و غربا دونون پر ایسا ہوتا ہے، کہ تحقیق دین اور فتویٰ
کے باب مین اعتبار اٹھ جاتا ہے، ان کے وعظ فتویٰ اور تقریر پر وثوق نہین رہتا خیال
ہوتا ہے، کہ شاید دنیا دارون کی خوشامد مین ایسا کرتے ہین"،

لیکن ایک اثر جو خود علماء پر امرا کی صحبت کا پڑتا ہے، وہ تو اتنا خطرناک ہے، کہ بالآخر اُن کے
دین ہی کو لے ڈوبتا ہے یعنی امرا کے منکرات پر روک ٹوک ان کے لئے دشوار ہو جاتی ہے، کیونکہ پھر تو

ان سے لطف صحبت ہی باقی رہنا مشکل ہوگا، جانبین کو انقباض ہوگا، اور چونکہ امرا کو بالعموم مقصود
بنا کر ملا جاتا ہے، ان کی خلاف شرع حرکتون پر سکوت کرنا پڑتا ہے،
جس سے علماء کے اندر مداہنت کی کیفیت پیدا ہوتی اور صحبت کی ترقی سے اس مین ترقی
ہوتی ہے، حتیٰ کہ قلب سے اس کا اثر زبان پر آتا ہے یعنی پہلے قلب مین حق کی عظمت اور باطل
سے نفرت کم ہو جاتی ہے، پھر زبان سے اظہارِ حق کی ہمت گھٹتی ہے، پھر باطل کا اظہار خفیف
معلوم ہونے لگتا ہے، پھر اس کا صدور ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ ان امرا کو اس کا احساس
ہو کر اتنا حوصلہ ہو جاتا ہے، کہ اپنی نفسانی خواہشون کے موافق ان علماء سے توجیہات کی
فرمایش کرنے لگتے ہین، اور یہ اُن کو پورا کرنے لگتے ہین،
اس مقام پر پہنچ کر اُن کا قلب مسخ ہو جاتا ہے، اور حق بینی کی استعداد ہی ضائع ہو جاتی ہے،
بلکہ الٹے کبھی کبھی اہلِ حق سے جدال و عناد پر آمادہ ہو جاتے ہین،

"پھر خود اُن کی اصلاح کی کوئی توقع نہین رہتی، اور اُمت محمدیہ کے لئے (العیاذ باللہ)
ابلیس سے زیادہ ضرر رسان ہو جاتے ہین، کہ اُن کے ہوتے ہوئے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے
تو بھی بعید نہین، مین نے اپنی آنکھون سے ایسے ہی طالبِ دنیا کو دیکھا ہے، کہ ایک ہزار روپیہ
لے کر اور ایک ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ حلت نکاح کا فتویٰ لکھ دیا، حدیث
مین اسی طرح کے مسخ قلب کا ذکر ہے، کہ لما وقعت بنوا سرائیل فی المعاصی
نھتھم علماءھم فلم ینتھوا فجالسوھم وآکلوھم وشاربوھم فضرب
اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون"
لیکن یہ سب خرابیان اسی وقت ہین جب امراء کو مطلوب بنا کر جاوین اسی کی مذمت احادیث صحیحہ مین ہے کہ
ابغض القراء الی اللہ الذین   یعنی اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض

یزدرون الامراء والعلماء اُمناءُ	وہ علماء ہیں، جو امراء سے ملتے ہیں، اور
الذین مالم یخالطوا الامراء فاذا خالطوا	علماء دین کے محافظ ہیں، جب تک امراء
الامراء فہم لصوص الدین ۔	سے میل جول نہ رکھیں، ورنہ دین کے ڈاکو ہیں

امراء سے اختلاط واجتناب کے شرائط

البتہ اگر امراء طالب ہو کر حاضر ہوں، یا کسی ضرورت سے خود علماء کو مدعو کریں، تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے کہیں گے، اور نذرانہ وغیرہ قبول نہ کریں گے، تو ایسی مخالطت محافظت دین ہے، کیونکہ اگر علماء اس طرح بھی اُن سے نہ ملیں، تو اُن کو دین کیونکر پہنچے گا، مگر اس طرح کا اختلاط فرض عین نہیں، کہ سب پر ضروری ہو، فرض کفایہ ہے، اور اس کے لئے ایسا شخص موزوں ہے، جو قوی القلب اور غنی النفس ہو، ورنہ ضعیف کے لئے سلامتی اسی میں ہے، کہ امراء سے بالکل نہ ملے، تبلیغ کے لئے دوسرے لوگ یا رسائل، اور کتابیں کافی ہیں"

سبحان اللہ کیا فہم دین ہے، اگر حدود سے تجاوز پر یہاں بھی تنبہ فرمایا، جو حضرت جامع المجددین کی تجدید کی خاص ونمایاں خصوصیت ہے کہ

امراء سے اجتناب کرنے میں ان کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے، بلکہ ان کو مبتلائے دنیا وجہل سمجھ کر رحم و دعا کرے، اور اپنے کو ضعف دین کا مریض جان کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا کمزور طبیعت والے کو جس میں تاثر کا مادہ زیادہ ہو، متعدی مرض کے مریض سے بچاتے ہیں، اور ساتھ ہی اس متعدی مرض کے مبتلا پر غصہ بھی نہیں کرتے، بلکہ رحم کھاتے ہیں

سبحان اللہ کیسی مجددانہ حدود شناسی اور پھر کیسی حکیمانہ اُن کی تفہیم ہے! ساتھ ہی پھر تنبیہ ہے کہ اس عدم غصہ اور عدم بغض کی بھی ایک حد ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہلِ حق سے بغض رکھے

یا تکبر کرے، تو اس سے بغض کرنا واجب وعبادت ہے، اور بغض فی اللہ یہی ہے،

آگے جاہ طلبی کی ایک اور دقیق تدبیر کا بیان ہے، کہ

جاہ طلبی کی ایک دقیق تدبیر

بعضے دنیا داروں کو دھتکار دیتے ہیں، سخت سست کہتے ہیں، حتی کہ بعضے پہرا بٹھا دیتے ہیں، اگرچہ یہ لوگ متکبر امراء کا پورا علاج ہیں، جن سے امراء کو ان کے تکبر کی سزا ملتی ہے، لیکن یہ تکوینی علاج ہے تشریعی نہیں، اور ایسا برتاؤ اخلاق شرع کے بالکل خلاف ہے، پھر بعضے ایسے بھی ہیں، کہ ان کا مقصود یہی ہوتا ہے، کہ اس طریقہ سے امراء میں شہرت ہوتی ہے، لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کو بہ نسبت متکبر کے ریاکار (اور جاہ طلب) کہنا زیادہ زیبا ہے،

یہ تو وہ لوگ تھے، جن کے اس طرز عمل کی غایت ہی جاہ تھی، بعضوں کے ہاں جاہ غایت و سبب نہیں، بلکہ مسبب ہوتی ہے،

"اور وہ لوگ واقع میں اپنے کو مقدس اور دوسروں کو گنہگار سمجھتے اس لئے اُن سے نفرت کرتے ہیں، ایسوں کو بہ نسبت ریاکار کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے، اور یہ تکبر دنیا داروں کے تکبر سے بھی زیادہ قبیح و شنیع ہے، کیونکہ ان لوگوں کو بہ نسبت دنیا داروں کے علم زیادہ ہے، اور علم کے ساتھ بدعملی عند اللہ مبغوض ہے، ان لوگوں کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے، لہٰذا ان کو کیا معلوم کہ جس کو یہ گنہگار جان رہے ہیں، اس کا خاتمہ کیسا ہوگا، اور خود اپنے کو جو مقدس یقین کر رہے ہیں، ان کا خاتمہ کیسا ہوگا"

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مناظرہ ومجادلہ کی حقیقت

بعض لوگ ضرورت بلا ضرورت بات بات میں مجادلہ ومناظرہ کرتے، اور دن رات اسی میں لگے رہتے ہیں، جس سے اکثروں کی غرض اپنی علمیت کا سکہ بٹھانا یا علمی جاہ طلبی

ہوتی ہے، جس کا،

"بعض اوقات یہان تک اثر ہوتا ہے، کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی باطل پر اصرار کئے جاتے ہین، کہ بات ہیٹی نہ ہو جائے، مین نے ایک ایسے ہی کا فتویٰ ایک قطعی رضاعی رشتہ مین نکاح کا دیکھا، کہ ابتدا مین تو ان سے غلطی ہوگئی، مگر پھر بات کی پیچ پڑگئی، تو باوجود سارے علماء کی مخالفت اور تحریراً و تقریراً تنبیہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا حتی کہ بعض ثقہ لوگون سے سُنا گیا کہ خود اپنے ایک بزرگ سے کہا کہ اب کیا کرون قلم سے نکل گیا اب تو تائید ہی کرنا ضروری ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ما ضل قوم بعد ھدی کانو علیہ الا اوتوا الجدل ثم قرء ھذہ الآیۃ ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم قوم خصمون جدل سے یہان مراد عناد، اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے تعصب ہے"

اور بعض آیات و روایات مین مجادلہ و محاجہ کا جو امر و اذن ثابت ہے، تو یہ مطلب نہین، کہ ہر مجادلہ ادرہر حال مین مذموم ہے، البتہ ہمارے زمانہ مین زیادہ تر ایسے ہی مجادلہ کا رواج ہے جو مذموم ہے، یا جس کا ترک محمود ہے، اور جس کی مذمت آیات و احادیث اور بزرگون کے کلام مین موجود ہے، اس کی تفصیل ذرا آج کل کے مناظرہ پسندون کے لئے کان کھول کر سننے کی ہے،

ظنی و قطعی مسائل کے حکم کا بڑا اہم فرق

"مسائل دو قسم کے ہین، ایک جن کی ایک شق یقیناً حق اور دوسری باطل ہو، خواہ سمعاً خواہ عقلاً، یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہین، دوسری قسم جس مین دونون جانب حق و ثواب کا احتمال ہو، یہ مسائل ظنیہ کہلاتے ہین، مسائل کلامیہ اکثر قسم اول سے ہین، اور بعض ثانی سے، اور مسائل فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہین، اور بعض اول سے"

"مسائل ظنیہ مین صرف ظنی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اہل علم مین باہم گفتگو و مکالمت جائز ہے، بشرطیکہ نہ بغض و عناد ہو، نہ ایک جانب کی قطعیت کا اعتقاد ہو، نہ دوسری جانب کے قطعی باطل ہونے کا یقین جازم، نیز جب سمجھ مین آجائے، تو اپنی رائے سے رجوع اور حق کے قبول کا عزم ہو،

"مگر مصلحت اس مین بھی یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہ ہو، اگر زبانی گفتگو ہو، مجمع خواص کا ہو اور اگر تحریری ہو، تو عام فہم زبان مثلاً ہندوستان مین اردو مین نہ ہو، عربی مین ہو، یا کم از کم فارسی مین تاکہ اگر کسی وقت وہ شائع ہو جائین، تو عوام تک اس اختلاف کا اثر نہ پہنچے، اور سلف سے اسی طرح کی گفتگو منقول ہے، نہ کہ جیسی آج کل ہوتی ہے کہ ایک قراۃ خلف الامام کا حق ہونا، اس طرح تبلا رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارک صلوٰۃ اور فاسق ہین، اور دوسرا اس کی اس طرح نفی کر رہا ہے، کہ گویا اس کے نزدیک، قراۃ خلف الامام کی کوئی حدیث ہی نہین، اور عین مناظرہ مین اگر مقابل کا قول دل کو لگ بھی جائے، تب بھی ہرگز قبول نہ کرین، بلکہ گفتگو شروع کرتے ہی رد ہی کا پختہ ارادہ رکھتے ہین، اور اسی نیت سے سنتے ہین، کیونکہ مقصود تمامتر اپنا غلبہ اور دوسرے کو ساکت کرنا ہوتا ہے، پھر باہمی عناد و فساد، حتی کہ نوبت عدالت تک پہونچتی ہے، کیا یہ دین ہے، کیا سلف صالح اور حضرات صحابہؓ کا ان مسائل مین یہی طریقہ تھا،

افسوس اگر آج مسلمان، ان ظنی مسائل مین اختلاف و گفتگو کو اپنے حدود مین رکھتے اور بقدر وقت کی حدود شناسی کو مشعلِ راہ بناتے، تو کتنے اور کیسے کیسے عجیب و مہلک مفاسد کا سدباب ہو جاتا، پھر ہمارے آج کل کے سیاسی و ملکی مسائل تو ان فقہی مسائل سے بھی زیادہ ظنی ہین ان

ہیں ایک دوسرے پر لعن طعن، سب و شتم، تکفیر و تفسیق اور وہ بھی کسی خاص مجمع اور خاص زبان میں نہیں، بلکہ عوام الناس کے بھرے جلسون، اور ہزار دو اخبار کے کھلے کالمون مین سیاسی و ملکی ہی کیا، اور عوام یا انگریزی دانون ہی پر کیا موقوف بعض متستند اور بہت سے غیر مستند مدعیانِ علمِ دین فقہی و ظنی مسائل تک کو رسائل و اخبارات کے میدان مین عوام الناس کے سامنے ڈال دینا، عین خدمتِ دین جانتے ہین، ع :-

ببین تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

کاش اسلام کے یہ نادان دوست مجددِ وقت کی ان باتون پر کان دھرتے، تو آج مسلمان ان دینی و دنیوی ہلاکتون اور ذلتون سے کیون دوچار ہوتے، حضرت جامع المجددین کی اصلاحات و تجدیدات ہر معاملہ مین ایسی جامع ہین، کہ بے ساختہ دل گواہی دیتا ہے، کہ اگر ان کا اتباع ہو تو دین و دنیا کی صلاح و اصلاح سب کا نقشہ سلف خدا چاہتا پھر سامنے آجاتا،

مسائل قطعیہ مین اختلاف کی مختلف حالتون کا حکم

اب رہ گئے مسائل قطعیہ جیسے کفر و اسلام کا اختلاف، یا اہلِ حق کے نزدیک جو متفق علیہ بدعت و سنت ہے، اس کا اختلاف تو اس مین چند حالتین ہین،

ایک یہ کہ صاحبِ باطل متردد و طالبِ حق ہے، اور اپنے شبہات صاف کرنا چاہتا ہے، اور اس غرض سے گفتگو یا مناظرہ کرتا ہے، تو جو شخص حق کی تائید پہ قادر ہو، اس پر ایسا مناظرہ واجب و فرض ہے، اور جب جواب سے عجز ہو تو صاف کہدینا چاہئے کہ اس کا جواب میری سمجھ مین نہین آتا، سوچ کر یا پوچھ کر تبلاؤن گا، یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ تبلادے، اور طالب کو چاہئے، کہ وہان جاکر رجوع کرے، ایسے مناظرہ سے انکار معصیت اور مَن سُئِلَ عن علمٍ فکتمہ الخ مین شامل ہو،

(۲) دوسری حالت یہ ہے کہ مخاطب طالبِ حق نہین، لیکن متکلم مناظرہ کو توقع و احتمال ہو کہ

شاید حق کو قبول کرلے، سو جب تک اس کی اُمید ہو، مناظرہ کرنا، تبلیغ احکام مین داخل ہے، کہ جہان تبلیغ واجب، وہان یہ مناظرہ واجب اور جہان مستحب ہے، وہان مستحب ہے، جنابِ سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اہل کتاب و خوارج سے مناظرات اسی قبیل کے تھے،

(۳) اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہین، نہ قبول کی امید ہے، مگر کسی مفسدہ و مضرت کا بھی اندیشہ نہین، اور کسی ضروری امر مین خلل کا بھی احتمال نہین، تو ایسی صورت مین ایسا مناظرہ مستحب ہے،

(۴) چوتھی حالت یہ ہے کہ طالب سے نہ امید قبول نہ کسی ضروری امر مین خلل نہ کسی مضرت کا اندیشہ ہے، تو اس صورت مین قوی ہمت کے لئے عزیمت و اولیٰ ہے، اور ضعیف ہمت والے کے لئے رخصت و غیر اولیٰ،

(۵) پانچوین حالت یہ کہ نہ طالب سے توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال یا کسی اہم دینی منفعت کے فوت ہونے کا احتمال ہے، اس صورت مین اس سے اعراض اور ضروری مین اشتغال واجب ہے، قرآن مجید مین اعراض، اور ترک جدال کا امر ایسے ہی موقع پر ہے، سورہ عبس کی شانِ نزول کا جو قصہ تھا، جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اجتہاد سے اس کو تیسری حالت مین داخل سمجھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پانچوین حالت مین داخل تبلایا،

(۶) چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے مین تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع ہے، اور نہ اس کو کسی خاص مضرت کا احتمال ہو، اور مناظرہ نہ کرنے مین عوام اہلِ حق کے شبہہ مین پڑجانے کا خوف ہو، اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو،

تاکہ علمائے اہلِ حق سے دریافت کر سکیں، تو اس صورت مین اس کی تدبیر واجب ہے

جو دو ہین،

"ایک یہ کہ خود اہلِ باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ مین مخاطب بنایا جائے، دوسری

یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جائے، بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جائے"

ان مین جس تدبیر کو اختیار کیا جائے، واجب ادا ہو جائے گا،

(۷) ساتوین حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالتِ ششم کے ساتھ وہ مسئلہ بھی ایسا ہو

کہ عوام اہلِ حق کو اس کے غلط ہونے کا شبہہ واقع ہو سکتا ہو، اس صورت مین خود

ان عوام پر واجب ہے، کہ علماء سے تحقیق کرین اور علماء پر جواب دینا واجب ہو گا، ورنہ

بدون سوال وہ سبکدوش ہون گے،

"اور ان تمام صورتون مین یہ واجب ہے کہ الفاظ و مضمون متانت و تہذیب کے خلاف

ہون، اور اگر دوسرا درشتی کرے تو بھی صبر افضل ہے،

ممنوع و مذموم بحث و مباحثہ

یہ ساری تفصیل و تقسیم ان امور مین ہے کہ جو شرعاً مقصود ہون بعض

وہ امور ہین، جو شرعاً مہتم بالشان نہین، جیسے خاندان چشتیہ کا باہم تفاضل، یا بعض وہ

امور جن مین بحث کرنے یا حکم لگانے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے، جیسے تقدیر

کا یا کوئی دوسرا ایسا ہی مسئلہ، مثلاً باوجود اس کے کہ کسی کا کلام صحیح معنی کو محتمل ہو،

پھر بھی اس پر کفر کا حکم لگانا، ایسے امور مین بحث و مباحثہ کرنا ممنوع و مذموم ہے جس

مرتبہ کی نہی یا منہی عنہ ہو گا، اسی مرتبہ کی ممانعت و مذمت ہو گی،

"اس سے معلوم ہوا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے، نہ مذموم، نیز تمام وہ نصوص و اقوال

اور عادات ائمۂ دین جو بظاہر اس باب مین متعارض نظر آتے ہین، اُن مین تطبیق ہو گئی"

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس زمانہ مین زیادہ ایسے ہی مناظرے شائع ہین، جو مذموم ہین"[1]

مغربون کے ملکی و سیاسی مناظرون نے مولویون کے دینی و مذہبی مناظرون کو بھی مات کر دیا

البتہ مولویون اور مذہب کے میدانی یا تحریری مناظرات کی جگہ جن مین

پھر بھی دین سے ایک لگاؤ تھا، اب حکومت و سیاست اور مغربون

کے میدانی یا اخباری مناظرات نے حاصل کر لی ہے، جن کو تحقیقِ حق و قبولِ حق سے اتنا بھی تعلق نہین

جتنا دینی مناظرون کے معمولی سے معمولی فریقین کو ہوتا تھا،

بس ہر جماعت اس کے ہر لیڈر و اڈیٹر اور ہر جلسہ و جلوس کا فرض یہ ہے کہ اپنی ہی بات

جہان تک ہو سکے، اتنے غل و ہنگامہ کے ساتھ کہے جائے کہ دوسرے کی نہ خود سُنے نہ کسی کو سننے دے

اور اس فرض کی ادائی مین بغض و عناد، دروغ و بہتان، مکر و فریب، لعن و طعن یہ سب فریقین کے لئے

عین سیاست اور عین تہذیب ہے، کیونکہ یہ سب پروپیگنڈا ہے، یہی نہین، بلکہ ہر درجہ کا طوفان بے تمیزی

فتنہ و فساد، ملک و قوم کی عین خدمت، بلکہ درجۂ جہاد ہے، فریق مخالف کے جلسون اور جلوسون

مین فتنہ برپا کر دینا، مقرر کو تقریر نہ کرنے دینا، شرم شرم کے نعرون سے آسمان سر پر اٹھا لینا،

جب ضرورت سوڈے کی بوتلون اور انڈون کی مار سے تواضع کرنا، اس سے بھی کام نہ چلے، تو

اینٹیں اور پتھر ہین، اور پھر یہ فتنہ و فساد کوئی اتفاقی نہین، بلکہ ہر جلسہ و جلوس مین اس کا احتمال،

اس لئے پہلے سے جلسہ و جلوس کی اجازت اور پھر موقع کے لحاظ سے پولیس یا فوج کی نگرانی لازم ہو گی

اور جو خوش قسمت اس قومی و سیاسی جہاد مین پولیس کے ڈنڈون اور فوج کی گولیون کیلئے سینہ پیش کر گئے

---

[1] ایک مناظرہ ہی کی بحث مین حضرت مجدد کی ان تجدیدی تنقیحات و تفصیلات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

کس طرح ہر مسئلہ کے تمام جزئی پہلو آئینہ فرماتے جاتے ہین، اور بظاہر متضاد سے متضاد جزئیات کی چولین

کس طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہین، اور ہر شے اپنی حد مین رہتی ہے، ع

این سعادت بزور بازو نیست

کام آسکے، اس کے مجاہد وشہید ہوتے ہیں کیا شک اجلسوں اور جلوسوں ہی کی قید نہیں، یوں بھی ترجمن میں جو دہشت انگیزی اور کشت وخون میں بازی لیجا سکے، مثلاً فلسطین کے یہودی، تو بس وہی برحق ہے، اس کے علاوہ نہ امریکہ کے ٹرومین کے پاس ٹرو یا حق کا کوئی معیار ہے، اور نہ برطانیہ کے پاس انصاف یا اپنے وعدوں کی شرم، بھلا حق وباطل کے پرانے مولویانہ مناظرہ کے فریقین کے پاس احقاق حق وابطال باطل کے لئے ایسی دہشت انگیزی کی منطق اور دلائل کہاں موجود تھے، جن کا مقابلہ بڑی بڑی حکومتوں کو اپنی فوجوں سے کرنا پڑے،

مسلمانوں کی جیت سیاسی مباحثہ ومناظروں میں بھی حضرت مجدد کے تجدید فرمودہ اصول میں ہے

کاش مسلمان اب بھی آنکھیں کھولتے کہ انھوں نے وحی نبوت کی روشنی کو رکھتے ہوئے دین ودانش دونوں آنکھوں کے کیسے اندھوں کا دامن تھام رکھا ہے! مسلمانوں کی تو دنیا کا بھی ہر اہم مسئلہ کسی نہ کسی طرح نفیاً یا اثباتاً بالواسطہ یا بلا واسطہ دین ہی کا مسئلہ ہے، اس لئے اگر وہ اغیار سے اخباری دنیڈالی بحث ومناظرہ میں صرف اپنی دینی راہ کے ان حدود وشرائط پر عمل پیرا ہو جائیں، جو حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے آخر میں بطور خلاصہ تحریر فرمائے ہیں، تو انشاء اللہ نصرت حق کی بدولت معاندین کے باطل پروپیگنڈے اور ناحق کی خونریزی ودہشت انگیزی کو بھی بالآخر مغلوب ہی ہونا پڑے گا، بس ذرا ایمان وعمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق وتواصی بالصبر کی ضرورت ہے، بہرحال مسلمانوں کے لئے بحیثیت مسلمان حکومت وسیاست کے بظاہر دنیادی مسائل میں بھی بحث ومباحثہ کے وہی آداب وشرائط ہیں جو خاص دینی مسائل میں ہیں،

"یعنی وہ مسئلہ دین میں مقصود بھی ہو، دل سے یہ عزم ہو کہ حق واضح ہو جائے گا تو فوراً قبول کرلیں گے، یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کریں گے، گو سمجھ میں بھی آجائے، مخاطب پر شفقت ہو، اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو، تو صبر ومعدلت کے ساتھ مقابلہ کرے، اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرے، الفاظ ومضمون نرم ہو، جو بات معلوم نہ ہو، نہ جاننے کا اقرار کرے، عار نہ کرے"

ذرا ان اصول کو مسلمان امتحاناً ہی کچھ عرصہ صبر وعزیمت کے ساتھ اپنے اخباری وسیاسی مباحثوں اور اکھاڑوں میں آزما دیکھیں، گو یہ صبر وعزیمت دین سے تعلق کے بغیر نصیب ہونا آسان نہیں تاہم جہاں ترقی کی سب تدبیریں کرتے ہیں، دین کے تعلق کو بھی بطور تدبیر ہی اختیار کر دیکھیں، مگر جب خود علمائے دین ہی طوفان بے تمیزی کے اس اکھاڑے میں کود پڑے ہوں، تو عوام سے کیا، اور کس منہ سے کہا جائے، اور دینی اعتبار سے لیڈروں کا شمار عوام ہی میں ہو ورنہ دہی ہونا تھا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے کہ ان باتوں کو دیکھ کر

"عوام الناس علماء سے بھی بدگمان ہو گئے ہیں، کہ یہاں ہر شخص دوسرے کی تکذیب کرتا ہے، اس لئے یا تو سب ہی کو چھوڑ دیتے ہیں، یا ایک کی طرف ہو کے مقابل کی بے آبروئی اور ایذا رسانی کے درپے ہوتے ہیں، اور باہمی عداوت قائم ہو کر ایک دوسرے کی بے آبروئی (بلکہ جان تک) کی فکر میں لگ جاتے ہیں، اور گروہ بندیاں ہو کر مسلمانوں کی قوت وجمعیت میں روزانہ ضعف وانحطاط ہوتا جاتا ہے، کبھی مار پٹائی ہو کر نوبت بعدالت پہنچتی ہے"

کیا یہ سب کچھ ابھی حال ہی میں جمعیۃ ولیگ وغیرہ کے انتخابات[1] کے سلسلہ میں دن دوپہر سارے ہندوستان میں دیکھا نہیں گیا، مگر علماء نے ان شرمناک واقعات سے یہ عبرت حاصل کی جو اس اکھاڑے میں نہیں تھے[2] وہ بھی اپنی ہی جماعت یعنی علماء ہی کے مقابلہ میں تال ٹھوک کر اتر آئے، البعض لوگ ان مفاسد سے قطع نظر کر کے اخباری یا پنڈالی بحث ومباحثوں کے طرح طرح کے مصالح وفوائد بیان کرتے ہیں، مگر شرائط بالا کے فقدان کی صورت میں ہوتا وہی ہے، جو ایسے مذہبی مناظرات میں

---

[1] ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں، [2] جمعیۃ علمائے اسلام،

ہوتا تھا، کہ "ملا آن باشد کہ چپ نشود" اب لیڈر آن باشد کہ چپ نشود" یعنی

ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے، ہر شخص دوسرے کا جواب، پھر وہ دوسرا اس کا

جواب الجواب، پھر وہ پہلا اس جواب الجواب کا رد، پھر دوسرا اس رد کا رد، دونوں اس

سلسلہ کو جاری رکھتے ہین"،

اور بقول ایک بڑے عالم ہی کے کہ "جب تک مولوی یا لیڈر کی زبان پر لقوہ اور ہاتھ پر فالج

نہ گرے، اس رد و قدح کا تحریری و تقریری سلسلہ بند نہین ہوسکتا"!

پھر ایک خرابازاری یہ ہے کہ مولویانہ وعظ کی طرح جس کس و ناکس کا جی چاہے لیڈرانہ

تقریر کے لئے بھی کھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ وعظ کے متعلق حدیثون مین ہے کہ

لا یقص الا امیر او مامور او مختال او مرائی یعنی وعظ امیر کہتا ہے یا مامور کہتا ہے،

(یعنی اس کو کہنا چاہئے) یا پھر شیخی باز (مختال) یا ریاکار، اسی طرح ہے کہ من تعلم صرف الکلام

لیسبی قلوب الناس لم یقبل اللہ یوم القیامۃ صرفاً و لا عدلاً، یعنی جو آرٹیری اور

الکلام) یا باتین بنانا" اس لئے سیکھتا ہے کہ لوگون کے دلون کو پھانسے، اس کا قیامت کے دن نہ

فرض عمل قبول فرمائے گا، نہ نفل،

آج کل اس "صرف کلام" یا باتین بنانے اور الٹ پھیر کرنے کا جیسا زور اور جیسا بیجا استعمال

ظاہر ہے، اور جیسے بہت سے واعظ بدون کافی علم کے وعظ کہنے لگتے ہین اور ضلوا و اضلوا کا مصداق

ہوتے ہین ویسے ہی آج کل کے بہت سے لیڈر و اڈیٹر سیاسی و دنیوی مسائل کو بھی پوری طرح جانے

اور سمجھے بغیر نام کے رہنما (لیڈر) بنکر خود بھی گمراہ ہوتے، اور دوسرون کو بھی گمراہ کرتے ہین،

(باقی)

اشتراکی مابعد الطبیعاتی افکار

اسلام کی روشنی مین

از جناب محمد منظر الدین صاحب صدیقی، بی، اے

مارکسیت کیا ہے؟

فویرباخ (Feuerbach) پر اپنے گیارہوین مضمون مین مارکس لکھتا ہے:-

"فلسفیون نے اپنے اپنے خیال کے مطابق صرف کائنات کی توجیہ کی ہے لیکن بنیادی سوال

تو یہ ہے کہ اسے تبدیل کیسے کیا جائے، اس سے ظاہر ہے کہ مارکس نے اپنے فلسفہ کو ایک عملی طریق کار

کی حیثیت سے پیش کیا، اور اگرچہ نظری اصول بھی مارکسیت کے اہم اجزا ہین لیکن مارکس کے نزدیک

عمل نظریہ مقدم ہے، اس کے معنی یہ نہین ہین کہ مارکسیت مین مرتب نظریات کی کوئی کمی ہے، بلکہ علوم

طبعی (Physical Sciences) کے نظریات کی طرح مارکسی نظریات بھی اپنی تفصیلات مین

مارکسیت کے عملی طریق کار کو دنیا کے حقیقی حالات و واقعات پر منطبق کرنے سے وجود مین آئے ہین،

هالڈین اپنی کتاب (Marxist philosophy and sciences) مین لکھتا ہے، کہ

مارکسیت کون (Being) سے نہیں بلکہ حدوث (Becoming) سے بحث

کرتی ہے یعنی وہ یہ نہین دیکھتی ہے کہ اشیائے عالم کیا ہین، اور کیا نہین، بلکہ کیا ہو رہی ہین، اسی لئے

مارکسیت کا دعوی ہے کہ وہ ہم مین صرف معاشی اور سیاسی انقلابات سمجھنے کی نہین، بلکہ جملہ تغیرات عالم

کے فہم و ادراک کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور اس طرح ہمین اس بات پر قادر بنا دیتی ہے کہ ہم ان

تغیرات پر قابو حاصل کرین، چنانچہ مارکسیت علم اور عمل کی وحدت کا اثبات کرتی ہے اور اُن کے درمیان کسی تفریق کو روا نہین رکھتی، لیکن ساتھ ہی وہ عمل کو مرجح اور مقدم قرار دیتی ہے، انجلس لکھتا ہے:

"یہ سوال کہ آیا انسانی فکر معروضی صداقت (Objective reality) یا خارجی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے، محض نظری مسئلہ نہین ہے، بلکہ ایک عملی سوال ہے، کیونکہ عمل کی دنیا مین انسان کو اپنے افکار کی صداقت کا ثبوت دینا ضروری ہے، یعنی اس بات کا ثبوت کہ اس کے افکار بے حقیقت اور بے اثر نہین ہین، بلکہ اس دنیا اور اس کے واقعات کے لئے نتیجہ خیز ہین، عالم خارجی، اور اس کے واقعات سے ہٹ کر انسانی فکر کی حقیقت رسی کی بحث بالکل لایعنی ہے،

ہالڈین لکھتا ہے کہ اس نقطۂ نظر سے مارکسیت اور نتائجیت[1] (Pragmatism) مین ایک گہری مماثلت ہے، لیکن اور ہر اعتبار سے ان دونون مین بڑا فرق ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ مارکسیت تغیرات عالم پر خاص طور سے زور دیتی ہے، عالم خارجی کی حقیقت کا اثبات کرتی ہے، اور یہ دعوی کرتی ہے کہ اگرچہ انسان صداقت مطلق تک کبھی نہین پہنچ سکتا ہے، لیکن وہ اس سے قریب تر ہو سکتا ہے،

مارکسیت اور جدلیات مارکسیت کے بنیادی اصول جدلیاتی اصول (Dialectical [illegible]) کہلاتے ہین، جدلیات کا لفظ یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے، یونانی زبان مین ابتداءً اس لفظ کے معنی مکالمہ کے تھے، سوفسطائیون کے عہد مین مکالمہ اور بحث و تکرار ایک مستقل فن بن گیا تھا، اس فن کے قواعد جدلیات (Dialectics) کہلاتے تھے،

---

[1] نتائجیت وہ فلسفہ ہے جس کی رو سے کسی نظریہ کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ وہ عملی زندگی مین اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ثابت ہو، نتائجیت ہر صداقت کو اس کی عملی کامیابیون یا ناکامیون کے لحاظ سے صحیح یا غلط قرار دیتی ہے،

اس قسم کے مباحث کا طریقہ یہ تھا، کہ متکلم کوئی خاص دعوی پیش کرتا تھا، اور اس کے بعد مخاطب اس امر کی کوشش کرتا تھا کہ اس سے کوئی ایسی بات کہلوا دے، جس سے اس دعوی کی نفی ہوتی ہو، اس طرح جدلیات فی الاصل بحث و مکالمہ کا ایک خاص طریقہ ہے، خواہ یہ بحث و تکرار دو اشخاص کے درمیان ہو یا کسی فرد واحد کے ذہن مین اس مین پہلے ایک دعوی کیا جاتا ہے، پھر ایک بالکل مخالف دعوی اس کی تردید کرتا ہے، پھر دونون مین جو نقص و خطا ہوتی ہے، اسے دور کر دیا جاتا ہے، اور ایک تیسری بات نکل آتی ہے، جو حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے، اس طرح یہ تردید و تطبیق کے ذریعہ جستجوے حقیقت کا ایک مخصوص طریقہ ہے،

یہ طریقہ دو اجزاے فکر پر مشتمل ہے، جن مین سے اگر ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے، اوّلاً یہ اس پختہ عقیدہ پر مبنی ہے، جیسے افلاطون نے پیش کیا تھا، کہ عالم کائنات کی بنیادی اور اصلی حقیقتین اشیاء خارجی نہین بلکہ افکار و تصورات ہین، دوسرے یہ تصورات جامد و ساکن نہین، بلکہ سیال حالت مین ہین، اور مسلسل حرکت کرتے ہوے نشو و ارتقاء کی منزلون سے گذرتے ہین، افلاطون نے افکار و تصورات کو کامل الذات، غیر متبدل اور بے حرکت قرار دیا تھا، اور یہ نظریہ پیش کیا تھا، کہ جدلیاتی طریق ہی سے حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، یعنی ایک ایسے طریقہ کے جس مین مخالف افکار کا پہلے اقرار و اثبات کر لیا جائے، پھر اُن کی تردید کی جائے، اور آخر مین اُن کے درمیان تطابق و توافق پیدا کیا جائے، ہیگل نے اس کے خلاف یہ خیال ظاہر کیا، کہ تصورات خود اس عمل سہ گانہ یعنی اثبات، تردید اور تطبیق سے گذرتے ہین، بالفاظ دیگر عالم کائنات کی تمام حقیقتین دراصل ایک واحد تصور کی جدلیاتی بحث و تکرار کا پرتو ہین، جس مین یہ تصور اپنے مختلف اور مخالف پہلوؤن کو اجاگر کرتا ہے، اور صرف مخصوص حقائق ہی نہین بلکہ کل عالم کائنات کے ایک جامع تصور ہے، جو اپنے اضداد کا اثبات اور پھر اُن کی تردید کرتا ہے اور اس کے بعد اُن

درمیان مطابقت پیدا کرکے اعلیٰ و برتر وحدتین قائم کرتا ہے، اس طرح یہ تصور مدریجاً اپنے ہی
کا انکشاف عمل مین لاتا ہے، گویا کہ کائنات ذہنِ الٰہی (Divine mind) ہے جو منطقی
وجوب (Logical necessity) کے تحت مدارج ارتقار کرکے اپنی تکمیل جدلیاتی طریقہ
پر کر رہا ہے، ہیگل نے چند اصول فکر وضع کئے تھے، جنھین جدلیاتی اصول کہا جاتا ہے،[1] اس کا نظریہ
یہ تھا کہ یہ اصول (Principles of Thought) ازل سے قائم ہین، اور ہمیشہ قائم رہین گے
عالم مادّی زمان ومکان مین ان فکری اصولون کا خارجی تحقق ہے، فیورباخ، مارکس اور انجلس
نے اس کے خلاف یہ دعویٰ کیا، کہ عالمِ فطرت مین یہ اصول پہلے سے کارفرما ہین، اور عالمِ افکار مین
اُن کی عملداری بعد مین قائم ہوئی، مارکس نے یہ خیال بھی پیش کیا، کہ فکر بشری درحقیقت عالمِ مادّی
کا پرتو ہے، جو ذہن انسانی پر منعکس ہوتا ہے، اور اس کے سانچہ مین ڈھل جاتا ہے، اسی طرح
انجلس نے ہیگل کی جدلیات کے متعلق یہ رائے قائم کی، کہ وہ اوّلاً مادہ کے خواص اور اس کے قوانین
حرکت کو ظاہر کرتی ہے، اور اس سے قوانین فکر صرف ثانوی طور سے مستنبط کئے جا سکتے ہین، اس
کا دعویٰ یہ تھا، کہ وہ اصول جو ہیگل نے عالمِ افکار کے لئے مرتب کئے تھے، مادی حالات و واقعات
پر بھی منطبق ہوتے ہین، خواہ ان کا تعلق عمرانیات اور معاشرتی علوم سے ہو یا فلکیات، حیاتیات
اور طبیعیات سے، چنانچہ انجلس ایک مقام پر لکھتا ہے،

ہیگل کے فلسفہ کی رو سے جدلیاتی ارتقار (یعنی اضداد کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر وحدت کا

---

[1] ان اصولون کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے، مختصراً یہ اصول تین ہین اوّلاً اضداد کی پیکار و آویزش سے اعلیٰ تر وحدتون کا قیام، دویم کمیت (Quantity) کی کیفیت مین تبدیلی، اور اس کے برعکس کیفیت (Quality) کی کمیت مین تبدیلی، سویم نفی کی نفی (Negative of Nagative) کا اصول،

ظہور) جس کی مثالین ہمین خارجی فطرت اور انسانی تاریخ مین ملتی ہین، اور جو عبارت ہے ایک
ایسی ترقی پذیر حرکت سے جس مین ادنیٰ تر وحدتین اعلیٰ تر وحدتون مین نمو کرتی ہین، تصور کی اس
ذاتی حرکت کا ایک موہوم چربہ ہے، جو ذہن انسانی کے افکار و خیالات سے الگ اور اس کی جولانیون
سے غیر متاثر ازل سے جاری ہے، مگر کوئی نہین کہہ سکتا ہے کہ کہان"

اس الٹی بات کو کسی طرح سیدھا کرنا تھا، ہم نے پھر ایک مرتبہ تصورات کو مادی طریقہ پر سمجھنے
کی کوشش کی یعنی اس حیثیت سے کہ وہ عالمِ خارجی کی حقیقی اشیا کی ذہنی تصاویر ہین، نہ یہ کہ عالم مادی
کی حقیقی اشیا، تصور کی فلان فلان ارتقائی منزل کی خارجی تصاویر ہین، اس طرح ہیگل کی جدلیات
عالم خارجی اور عالمِ افکار دونون کے عام قوانین حرکت کا علم بن گئی، یعنی قوانین کے دو مجموعے ہین
جو دراصل ایک ہین، لیکن اپنے طریق اظہار مین مختلف ہین، اگر ایک طرف ذہن انسانی ان قوانین
کو عالم خارجی کے حالات و واقعات پر پورے فہم و شعور کے ساتھ منطبق کر سکتا ہے، تو دوسری طرف
عالم فطرت اور بڑی حد تک انسانی تاریخ مین بھی قوانین غیر شعوری طور سے کارفرما ہین، اس طرح
تصور کی جدلیات عالمِ حقیقی کی جدلیاتی حرکت کا آئینہ بن گئی، اور ہیگل کی جدلیات کو جو سر کے بل کھڑی
تھی، سیدھا کرکے پیرون کے بل کھڑا کر دیا گیا،

جدلیاتی اصول

جدلیات کا پہلا اصول اضداد کی وحدت کا اصول ہے یعنی ہر نظام زندگی، ہر تصور
ہر مادی شے، اور معاشرتی حالت اپنے اندر اپنی ضد کو پرورش کرتی ہے، جو ایک خاص نوبت پر ظاہر
ہو کر اس سے متصادم ہو جاتی ہے، پھر اس پیکار و تصادم سے ایک نئے نظام نئے تصور، نئی مادی
شے یا معاشرتی حالت کی تخلیق ہوتی ہے، یا اس اصول کو یون بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ ہر شے
دو متضاد حقیقتون یا صفات کا مجموعہ ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ زید ایک انسان ہے، تو مین ایک مخصوص
فرد کو چند مخصوص حالات مین ایک عمومی حقیقت یعنی انسان کے مترادف قرار دے رہا ہون اس طرح

مین درحقیقت دو اضداد کو جمع کر رہا ہون، اسی طرح مین یہ کہہ سکتا ہون کہ اس میز کی لکڑی بہت سخت ہے، کیونکہ اگر وہ سخت نہ ہوتی، تو اس پر کوئی وزنی چیز نہین رکھی جاسکتی تھی، اور ساتھ ہی یہ لکڑی نرم بھی ہے، کیونکہ اگر وہ نرم نہوتی، تو اس کے ٹکڑے نہین کئے جاسکتے، اس طرح لکڑی مین دو متضاد صفات جمع ہین، اس قسم کے دعوون کی توجیہ ہم دو طرح سے کرسکتے ہین، ایک تو ہم افلاطون کی طرح یہ کہہ سکتے ہین، کہ اشیائے مادی بے حقیقت ہین، اور حقیقی وجود صرف عمومی تصورات یا اعیان (universals) کا ہے، دوسرے ہم یہ کہہ سکتے ہین، جیسا کہ انجلس کا قول تھا، کہ مادہ مین دونون اضداد جمع ہین، لیکن اس کے معنی یہ ہون گے، کہ مادہ اس سے کہین زیادہ باصفت اور پیچیدہ شے ہے، جتنا کہ اٹھارہوین صدی کے مادہ پرست سمجھتے تھے، دوسرا جدلیاتی اصول یہ ہے کہ کمیت (quantity) کیفیت (quality) اور کیفیت کمیت مین تبدیل ہوسکتی ہے، جیسا کہ مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ مین لکھا ہے،

"علوم طبیعی کی طرح یہان بھی معاشرتی علوم ہین،"

ہیگل کے اس اصول کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی منطق مین پیش کیا ہے کہ کمی تغیرات (quantitive changes) ایک خاص حد کے بعد کیفی تغیرات (qualitative changes) مین تبدیل ہوجاتے ہین، اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ کیمیاوی خواص اس کے نقطۂ انجماد پر بدل جاتے ہین، اسی طرح اگر پانی کو حرارت پہونچائی جائے، اور حرارت کی مقدار مین اضافہ ہوتا رہے، تو حرارت کی ایک خاص مقدار کے بعد پانی کے خواص مین تبدیلی شروع ہوجاتی ہے، پانی کا حجم جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، دفعۃً تیزی سے بڑھنے لگتا ہے، اور اس کے بعض دوسرے خواص ناپید ہوجاتے ہین مثلاً اس نقطۂ حرارت پر پانی مین کوئی چیز حل نہین کی جاسکتی ہے، اسی طرح کاربن ڈائی اکسائڈ (Carbonai oxide)

کی مثال ہے، سو سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ یہ گیس بالکل زہریلی ہے، اگر کوئی شخص خالص کاربن ڈائی آکسائڈ مین سانس لے تو فوراً مرجائے گا، لیکن اب یہ ثابت ہوگیا ہے، کہ اس گیس کی ایک محدود مقدار انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے، اسی طرح اشیاء کی مقدار کے تغیر سے اس کے صفات بدل جاتے ہین، یہی چیز بعض اخلاقی نظامات مین بھی صحیح پائی جاتی ہے، مثلاً ارسطو کا دعوی ہے کہ خیر و شر کا فرق زیادہ تر مقادیر کے فرق سے وجود مین آتا ہے، مثلاً بزدل آدمی بے باک آدمی اور جری آدمی مین فرق یہ ہے کہ بزدل آدمی بہت کم، اور بے باک آدمی بہت زیادہ خطرت برداشت کرتا ہے، اُن کے مقابلہ مین جری آدمی ایک حد اعتدال تک خطرات برداشت کرتا ہے، معاشرتی علوم مین اس اصول کا اطلاق اس طرح ہوتا ہے، کہ وہ اصول و قوانین جو معاشرتی ارتقاء کی ایک خاص منزل پر انسانیت کی رہبری کرتے ہین، حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی سے دوسرے دور کے لئے بیکار ہوجاتے ہین،

تیسرا جدلیاتی اصول، نفی کی نفی (Negative of Negative) ہے، اس کی مثال مارکس نے معاشی تاریخ سے دی ہے، پہلے اوس نے قرون وسطیٰ کی انگریزی صنعتون کا حال بیان کیا ہے، جب دستکار اور مزدور اپنے آلات پیدائش کے خود مالک تھے، اور بعض صورتون مین وہ زمینون کے مالک بھی ہوتے تھے، اس کے بعد صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا، اور سرمایہ داری کا زور بڑھنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دستکار اور مزدور آلات پیدائش کی ملکیت سے محروم کردیئے گئے، اُن کی زمینین بڑے بڑے جاگیردارون اور زمیندارون نے بجبر حاصل کرلین تاکہ انھین بڑے پیمانہ پر کاشت کرسکین، اس کے علاوہ نئے کارخانون کی مشینی پیداوار کے مقابلہ مین اُن کی دستی صنعتین بے کار ہوگئین، اور یہ طبقہ آلات پیدائش کی ملکیت سے محروم ہوگیا، جس کی وجہ سے اس کی حیثیت صرف بے ملک مزدور کی سی رہ گئی، اس طرح گویا مزدورون کی ملکیت کی نفی ہوگئی لیکن مارکس دعوی کرتا ہے، کہ اب اس نفی کی نفی ہو رہی ہے، یعنی اب اشتراکی تحریک کے ذریعہ سرمایہ دار جنھون نے آلات پیدائش

پر قبضہ کر رکھا ہے، ان کی ملکیت سے محروم ہو جائیں گے، اور ایک لحاظ سے مزدور پھر اجتماعی طور پر آلاتِ پیدائش کے مالک ہو جائیں گے، مارکس کے خیال میں نفی کی نفی ایک ایسا اصول ہے، جو تمام ترقیات توقعات اور جدتوں کا سرچشمہ ہے، لینن، ایک جگہ لکھتا ہے،

"ارتقا کے دو بنیادی نظریات ہیں، ایک یہ کہ ارتقاء درحقیقت نام ہے کمی، بیشی، یا اعادہ کا دوسرا یہ کہ ارتقاء عبارت ہے، اضداد کی ترکیب اور وحدت سے پہلا نظریہ خشک اور بیجان ہے، دوسرا زندگی اور حقیقت سے قریب تر ہے، یہی دوسرا نظریہ موجوداتِ عالم میں ہر شے کی حرکت و ترقی کی توجیہ کرتا ہے، اسی سے ہم ان تغیرات کو سمجھ سکتے ہیں، جو اچانک طور پر واقع ہوتے ہیں، اور بظاہر فطرت کے تسلسل میں خلل ڈالتے نظر آتے ہیں، اسی سے ہم قدیم کی شکست اور جدید کی تخلیق کا سُراغ پا سکتے ہیں، جدلیاتی عمل کی ایک اور مثال یہ ہے، کہ ہم کبھی عمل کو اس کے خارجی حالات سے جدا کرکے دیکھتے ہیں، اور اس کے متعلق ایک نظریہ قائم کرتے ہیں، جو بعد میں غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہم نے اس شے یا عمل کے پس منظر پر غور نہیں کیا تھا، اب کسی نقاد کے لئے یہ کہدینا آسان ہے کہ تمہارا نظریہ پہلے ہی سے بالکل مہمل تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم کوئی ایسا نظریہ نہ قائم کریں جو ایک خاص حد تک حالات و واقعات پر منطبق ہونے کے بعد پھر ان پر صحیح نہیں اُترتا ہے، اس وقت تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے، کہ اس نظریہ کی تشکیل میں ہم نے واقعات کے کن پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا تھا، جن پر غور کرنا ضروری تھا، اس طرح نظریات قائم کرنا اور پھر تجربہ سے ان کے نقائص دور کرنا ایک اہم جدلی عمل ہے،

مارکسیت اور مادیت

مارکسیت کا دعویٰ ہے، کہ ذہنِ انسانی مادہ کی پیداوار ہے، نہ کہ اس کے برعکس، ہیگل کے نظریہ کے جو تصور کو کائنات کی بنیادی حقیقت قرار دیتا تھا، بالکل برعکس مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ اصلی اور حقیقی وجود صرف مادہ کا ہے، اور مادہ ہی کے درجہ بدرجہ ارتقاء سے کائنات

کے جملہ مظاہر کی توجیہ کیجا سکتی ہے، نفس انسانی، اس کا شعور اور اس کے تصورات یہ سب درحقیقت مادہ کی پیداوار ہیں، لینن کہتا ہے، کہ طبعیات میں جو جدید انکشافات عمل میں آئے ہیں، اُن سے مادیت کے اس بنیادی تصور کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ہے، کہ مادہ کا وجود ہمارے ذہن، اور ہمارے وقوف (Cognition) پر منحصر نہیں ہے، بلکہ ایک معروضی حقیقت (Objective reality) ہے جو اپنی ذات سے موجود ہے، اور ہمارے ذہن و شعور کی کسی طرح محتاج نہیں ہے، یہی معروضی حقیقت ہمارے تمام علم و ادراک کا سرچشمہ ہے، بالفاظ دیگر انسانی علم و وقوف اشیاے مادی کے محتاج ہیں، کیونکہ یہی اشیا، حواس انسانی کو متاثر کرکے اس کے تجربات کا ذخیرہ بہم پہنچاتی ہیں، اور تجربہ و مشاہدہ علم انسانی کی بنیاد ہے، اس طرح مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو بالکل الٹ دیا، ہیگل کا دعویٰ یہ تھا کہ اصلی وجود صرف تصورات کا ہے اور اشیاے مادی ان تصورات کا خارجی عکس ہیں، مارکسیت کا نظریہ یہ ہے، کہ فطرت (Nature) یا مادہ ازلی ہے، اور ذہن و شعور ثانوی حیثیت رکھتا ہے، مادہ نے حیات کی صورت اختیار کی، حیات سے احساس پیدا ہوا، اور احساس سے ذہن، اس کی توثیق علم الارض (Geology) کی تحقیقات سے ہوتی ہے، جنھوں نے بقول مادئین یہ ثابت کر دیا ہے کہ کرۂ ارضی انسان سے قبل وجود میں آیا ہے، چنانچہ انجلیس لکھتا ہے،

"یہ مادی دنیا جس کا ادراک ہم اپنے حواس سے کرتے ہیں، یہی اور صرف یہی حقیقی ہے، ہمارا شعور اور ہماری فکر خواہ وہ ہمارے حواس و مدرکات سے بالاتر کیوں نہ معلوم ہوں، اسی مادی جسم اور اس کے اعضاء کی پیداوار ہیں، مادہ ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ ذہن مادہ کی پیداوار ہے"،

مارکسیت اور نظریۂ ارتقاء

مارکسیت ڈارون اور اس کے جانشینوں کے مرتب کردہ نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کرتی ہے، اور واقعات عالم کی توجیہ کے لئے اسی نظریہ کو استعمال کرتی ہے، لیکن وہ ارتقاء کے قدیم ڈارونی نظریہ کے ایک پہلو کو نہیں مانتی، ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنسدانوں کا دعویٰ تھا

کہ فطرت مین جملہ ارتقائی تغیرات تدریجاً عمل میں آتے ہین، اور فطرت کا تسلسل کہین نہین ٹوٹتا ہے
یہ نہیں ہوتا ہے کہ فطرت مین کوئی تغیر اچانک واقع ہوجائے، مارکسیت اس کے برعکس فطرت مین
اچانک تغیرات کی قائل ہے، یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، کہ فطرت تدریج وتسلسل سے کام لینے کے
بجائے ایک جست لگاکر آگے بڑھ جاتی ہے اور کسی ایسی شے یا ذی حیات ہستی کو وجود مین لے آتی ہے
جو اشکال وصفات کے لحاظ سے اپنے پیشرو دون سے بالکل جداگانہ ہو، چنانچہ پاکھانو (Pal
Khanok) لکھتا ہے،

بہت سے لوگ جدلیات کو نظریۂ ارتقاء کے مترادف قرار دیتے ہین، بیشک جدلیات بھی
ارتقاء کا ایک نظریہ ہے، لیکن اس مین اور عام نظریۂ ارتقاء مین ایک بنیادی فرق ہے، قدیم نظریۂ
ارتقاء اس یقین پر مبنی ہے، کہ نہ تو فطرت مین اور نہ انسانی تاریخ مین کوئی تغیر اچانک واقع ہوسکتا ہے
کیونکہ دنیا مین تمام تغیرات تدریجاً عمل مین آتے ہین، ہیگل نے پہلے ہی بتادیا تھا، کہ اس مفہوم مین
نظریۂ ارتقاء بالکل مہمل ہے؛

درحقیقت مارکسیت کا ارتقائی نظریہ لائڈ مارگن (Lloyd margan) کے جدید
نظریۂ ارتقاء سے بہت قریب تر ہے جس کو نظریہ بروز (Emergence theory) کہا جاتا ہے
بروز کا نظریۂ ارتقاء ان مشاہدات پر مبنی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ عالم انسانی اور عالم فطرت
دونون مین ایسے نئے صفات اور خواص کا ظہور ہوتا ہے، جو بالکل غیر متوقع ہوتے ہین، اور سابقہ
حالات سے ان صفات وخواص کا وہم وگمان بھی نہین کیا جاسکتا ہے، مثلاً دو رنگون کے امتزاج
سے ایک نیا رنگ پیدا ہوجاتا ہے، جو بلحاظ صفات اپنے عناصر ترکیبی سے بالکل جدا ہوتا ہے!
ہائڈروجن اور آکسیجن کے متناسب امتزاج سے پانی وجود مین آجاتا ہے، جو ان دونون سے بالکل
مختلف خواص رکھتا ہے، اگر کوئی شخص ہائڈروجن اور آکسیجن کے خواص کا مطالعہ کرے تو وہ

پیشین گوئی کبھی نہین کرسکتا کہ ان کے امتزاج سے کوئی ایسی شے وجود مین آسکتی ہے، جیسے پانی، کیونکہ پانی
کے خواص ہائڈروجن اور آکسیجن کی کسی خاصیت سے نہین ملتے، مارکسیت انسانی نفس وشعور کی توجیہ
اسی طرح کرتی ہے' اس کا دعویٰ ہے، کہ انسانی تغیر اور اس کا شعور انھین مادی وجسمانی اعضاء کی
کی ترکیب سے وجود مین آیا ہے، لیکن جس طرح پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے بلحاظ خواص بالکل
مختلف ہے، اسی طرح انسان کا ذہن اس کے جسم سے باعتبار صفات بالکل جداگانہ ہے، یعنی
اجزائے جسم کی ترکیب سے ایک اعلیٰ تر شے وجود مین آگئی جو بالکل نئی ہے، اور جس کی کوئی پیشین گوئی اس کے
عناصر ترکیبی کو دیکھ کر نہین کی جاسکتی تھی، اسی طرح ذہن مادہ ہی کی پیداوار ہے، نہ یہ کہ مادہ ذہن
کی پیداوار ہے، جیسا کہ ہیگل اور جرمن عین پرستون کا خیال ہے،

مارکیت اور دائمی صداقتین

مارکسیت کسی دائمی صداقت کو نہیں مانتی ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ
تاریخ اور فطرت کے جملہ مظاہر، تغیر اور نشوونما، اور ترقی کے آثار ومشاہدات سے معمور ہین، اس لئے
اس دائرہ مین کوئی صداقت دائمی نہین ہوسکتی، ہوانجلس کہتا ہے،

"جہان تک انسانی تاریخ کا تعلق ہے، دائمی صداقتین صرف اس قسم کی مہملیات ہوسکتی ہین
جیسے تمام انسان فانی ہین، یا انسانیت اب تک ہمیشہ حاکم ومحکوم طبقات مین منقسم رہی ہے، یا یہ کہ نپولین
نے ۵ رمئی ۱۸۲۱ء مین انتقال کیا"

پھر بھی مارکسیت اس بات کو تسلیم کرتی ہے، کہ ایسے اصول ہوسکتے ہین، جو تاریخ کے کسی مخصوص
دور مین انسان کی رہبری کا کام دین لیکن یہ دور ایک متعین زمانہ کے بعد ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد پھر
وہ اصول کام مین نہین آسکتے، کیونکہ معاشرتی حالات بدل جانے کے بعد ان اصولون مین صداقت
نہین رہتی ہے، مارکسیت انسانی فکر کی محدودیت کو تسلیم کرتی ہے، اور اسی محدودیت کے باعث انسان
سے جو خطائین اور لغزشیں سرزد ہوتی ہین' وہ انسان کی آیندہ ذہنی ترقی اور صداقت فکر کی کامیاب

تلاش کے لئے ضروری قرار دیتی ہے، چنانچہ انجلس اس کے بارے میں لکھتا ہے،

انسانی فکر کی سیادت اور مطلقیت منفرد اشخاص کی محدود اور غیر مطلق فکر کے ذریعہ قائم ہوتی ہے،

وہ علم جو غیر مشروط یعنی مطلق صداقت کا حامل ہو، خطاؤں اور لغزشوں کے ایک طویل سلسلہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے نوعِ انسانی کی حیات کا لامتناہی ہونا ضروری ہے، یہان بھی ہمیں ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے، وہ یہ کہ انسانی فکر اپنے منتہار اور قابلیت کمال کے لحاظ سے تو مطلق ہے، لیکن اس کا اظہار بہر حال اشخاص ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، جن کی پروازِ فکر تنگ اور محدود ہے، یہ تضاد اس وقت حل ہو سکتا ہے، جب نسلِ انسانی کا سلسلہ لامتناہی ہو، اس لحاظ سے انسانی فکر کی سیادت اور غیر محدودیت ایک حقیقت ہے بھی اور نہین بھی ہے، اپنے منصب اپنے میلان ارتقا اور اپنی تاریخی غایت کے لحاظ سے تو وہ یقیناً ایک بالاتر اور غیر محدود حقیقت ہے، لیکن جب اس کا ظہور انسان کی انفرادی ذات مین ہوتا ہے، تو وہ محدود ہو جاتی ہے، اسی طرح کسی مخصوص تاریخی دور مین اس کا مجموعی ظہور محدودیت سے پاک نہین ہو سکتا، یہی حال ابدی صداقتوں کا بھی ہے، اگر انسان کبھی اس منزل ترقی تک پہنچ جائے، جہان وہ صرف ابدی صداقتون کے ذریعہ دنیا کا کام انجام دیسکے، یعنی ایسے نتائج فکر کے ذریعہ جو غیر مشروط اور مطلق صداقت کے حامل ہوں، تو اس کے معنی یہ ہون گے، کہ انسان لامتناہی سلسلہ کی انتہا، کو پہنچ گیا، اور عالمِ حقیقی کے کل محدود امکانات بروے کار آچکے"۔

مارکسیت اور وحی و الہام

مارکسیت انسان کے خارجی تجربات کو اس کے تمام علمی تصورات کا ماخذ قرار دیتی ہے، اس لئے وہ انسانی حواس و مدرکات کے سوا اور کسی ذریعہ علم کو حقیقی نہین تسلیم کرتی، پروفیسر داس گپتا اپنی کتاب (Materialism, Marxism, Determinism and Dialectics) مین لکھتے ہین:-

"علم کا سارا مواد ہمیں عالم مادی کے تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے، مختلف تجربات کے باہمی تعامل سے نئے افکار و تصورات پیدا ہو سکتے ہین، جن کا ممکن ہے ہمارے خارجی مدرکات سے کوئی تعلق معلوم نہ ہو، لیکن اگر ان افکار و تصورات کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کیجائے، تو معلوم ہوگا، کہ ہمارے سابقہ تجربات ہی مین سے کوئی نہ کوئی تجربہ ان کا ماخذ و سرچشمہ ہے، الہامِ ربانی، فکرِ خالص اور وجدان علم کے ذرائع نہین ہو سکتے، یہ محض افسانے ہین، درحقیقت انسان کے تجربات جن کا کبھی وہ شعور رکھتا ہے، اور کبھی نہین رکھتا، لیکن اپنی زندگی کے ہر لمحہ مین حاصل کرتا رہتا ہے، اس کے تمام تصورات و نظریات کا مواد ہین، جب وہ انھین عملی دنیا مین آزما لیتا ہے، تو یہی تصورات و نظریات علمی حقائق بن جاتے ہین، ایک سائنسدان یا فلسفی اپنے علمی نظریات ان تجربات پر قائم کرتا ہے، جن کا وہ غیر شعوری طور پر حامل ہوتا ہے لیکن جس چیز کو الہامِ ربانی کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہین کہ کسی لطیف اور حساس ذہن مین اس کے غیر شعوری تجربات جگہ پا لیتے ہین، اور کسی تخلیقی مدعا کے حصول مین اس کی رہنمائی کرتے ہین، جب کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کوئی تصور خالص کسی تخلیقی عمل یا سائنٹفک انکشاف کا سبب ہے تو ہوتا یہ ہے کہ خارجی تجربات کا کوئی ذخیرہ کسی ذہین شخص کی بالغ نظر اور اعلیٰ صلاحیتِ فکر کے ساتھ مل کر ایک نئی صورت مین ظاہر ہوتا ہے"۔

مارکسیت اور خارجی ماحول

مارکسیت کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ ہر مادی واقعہ اور ہر فکری فلسفہ کو ان حالات کی روشنی مین سمجھنا چاہئے، جن مین وہ وجود پذیر ہوا ہو، کسی واقعہ یا نظریہ کی صداقت کو اس کے خارجی احوال سے جدا کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا اصولاً غلط ہے، اور یہ کوشش کبھی کامیاب نہین ہو سکتی، کیونکہ عالم ایک سلسلۂ واقعات ہے، جس مین ہر واقعہ دوسرے واقعہ کے ساتھ علت و

معلول کے رشتہ سے جڑا ہوا ہے، لیکن اگر ایک طرف مارکس ماحول کی تخلیقی قوت پر زور دیتا ہے تو
دوسری جانب وہ یہ نظریہ بھی پیش کرتا ہے، کہ انسان اپنے ماحول مین تبدیلی کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے،
چنانچہ پانکھانوز (Pannekoek) لکھتا ہے:

"مارکس کو اپنے مادہ پرست پیشرؤون سے یہ شکایت تھی، کہ انھون نے اس امر کو نظر انداز کر دیا
کہ اگر ایک طرف آدمی اپنے ماحول کا مخلوق ہے، تو دوسری طرف ماحول خود اس کی کوششون سے
تبدیل ہو سکتا ہے، مارکس کے نظریہ کے مطابق تاریخی واقعات کی دنیا مین مادیت کا کام یہ ہے
کہ وہ اس امر کی تشریح کرے، کہ کس طرح ماحول ان ہی انسانون کے ہاتھون تبدیل ہوتا ہے
جو اس کی پیداوار ہین"

ماحول کے تغیرات مین انسان جو حصہ لیتا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے انجلس نے لکھا ہے:

"طبعی علوم اور فلسفہ نے اس پہلو پر کبھی غور نہین کیا کہ انسان کے مشاغل اور اس کے اعمال
اس کی قوتِ فکر اور طرزِ خیال پر ضرور اثر انداز ہوتے ہین، یہ علوم انسان کو ایک طرف رکھتے ہین، اور
فطرت کو دوسری طرف، لیکن فطرت مین جو تبدیلیان انسان خود اپنی سرگرمیون سے پیدا کرتا ہے، وہی
انسانی فکر کی لازمی اور حقیقی بنیاد ہین، چنانچہ جس قدر انسان نے خارجی فطرت کو تبدیل کرنے مین
کامیابی حاصل کی، اسی قدر اس کی عقلی قوت مین ترقی ہوئی، تاریخ کا طبیعاتی تصور جو ڈریپر
(Draper) اور دوسرے طبعی سائنسدانون (Natural Scientists)
کی تحریرون مین ملتا ہے، اور جس کی رو سے تنہا خارجی فطرت انسان پر عمل کرتی ہے، اور صرف
طبعی حالات انسانی تاریخ کی تشکیل کرتے ہین، بالکلیہ یکطرفہ ہے، اس تصور مین یہ امر فراموش کر دیا
گیا ہے، کہ انسان بھی فطرت پر عمل کر سکتا ہے، اس پر اثر ڈال سکتا ہے، اور اسے تبدیل کر کے زندگی
کے نئے حالات پیدا کر سکتا ہے،

مارکسیت اور تاریخی حوادث

تاریخی حالات و واقعات کے متعلق مارکسیت کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ
مین کوئی واقعہ بلا وجہ نہین ہوتا، بلکہ اپنے پیشرو واقعات کا نتیجہ یا معلول ہوتا ہے، اس طرح انسانی
تاریخ مین علت و معلول کا قانون اسی طرح کارفرما ہے، جس طرح خارجی فطرت مین اسی لئے تاریخی
واقعات مین ایک خاص ترتیب نظر آتی ہے، لیکن تاریخ انسانی اور فطرت خارجی کے واقعات مین
فرق یہ ہے کہ فطرت مین جو کچھ ہوتا ہے، وہ بے شعوری کی حالت مین ہوتا ہے یعنی اشیاء خارجی
غیر شعوری طور پر ایک فطری قانون کی پابند ہین، اور ان مین جو تبدیلیان اور ترقیان نظر آتی ہین،
ان مین ان کے ارادہ و اختیار اور شعور کو دخل نہین، اس کے برخلاف انسان جو کچھ کرتا ہے، سمجھ بوجھ
کر کرتا ہے، اور تاریخ انسانی کے تغیرات انسانی شعور و ارادہ کے ماتحت ہوتے ہین، پھر بھی انسانی
تاریخ مین اضطرار، بے شعوری اور عدم اختیار کا ایک عنصر ضرور موجود ہے، جس کے متعلق انجلس لکھتا ہے

"ایک لحاظ سے انسانی معاشرہ کے ارتقاء کی تاریخ ارتقائے فطرت سے بالکل جدا ہے، فطرت
پر انسان جو اثر ڈالتا ہے، اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے، تو اس مین صرف کورانہ قوتین
ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہین، اور ان قوتون کے تعامل سے عام قوانین، فطرت اپنا
کام کرتے رہتے ہین فطرت مین جتنے واقعات پیش آتے رہتے ہین، خواہ وہ ان بے شمار حوادث کے
کی شکل مین ظہور پذیر ہون، جن کا مشاہدہ اشیائے فطرت کے سطحی تغیرات مین کیا جاتا ہے، یا ان
نتائج ہون، جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان حوادث کی تہ مین ایک باقاعدگی اور تسلسل
موجود ہے، ان مین کوئی واقعہ بھی کسی ارادی کوشش یا شعوری مقصد کے تحت پیش نہین آتا ہو
لیکن انسانی معاشرہ کی تاریخ مین جتنی قوتین کام کرتی ہین، وہ سب اپنے مقصد کا پورا پورا
شعور رکھتی ہین کیونکہ انسان ہمیشہ سوچ سمجھ کر کسی مقصد کے تحت عمل کرتا ہے، کوئی عمل ایسا
نہین ہوتا ہے جس کی پشت پر کوئی شعوری مقصد نہ ہو، لیکن اس بنیادی فرق کے باوجود یہ بھی

ایک حقیقت ہے کہ عموی باطنی قوانین (General inner laws) تاریخ کی تشکیل
کرتے ہیں، کیونکہ یہاں افراد کے شعوری مقاصد کے باوجود مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اتفاقات
حوادث انسانی تاریخ پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں جس چیز کے لئے ارادی طور پر کوشش کی جاتی ہے
وہ بہت کم واقع ہوتی ہے، بیشتر صورتوں میں مختلف افراد جماعتوں کے ارادی اور شعوری مقاصد
ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں، یا خود وہ مقاصد اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ناممکن
الحصول ہوتے ہیں، اور ایسا بھی ہوتا ہے، کہ مقاصد تو قابلِ حصول ہوتے ہیں، مگر اُن کے حصول
کے ذرائع ناکافی ہوتے ہیں، اس طرح مختلف منفرد اشخاص و جماعات کے ارادوں اور کوششوں
میں تصادم واقع ہوتا ہے، جس سے انسانی تاریخ میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بے شعور
فطرت میں ہے، انسانی اعمال و افعال کے مقاصد تو ارادی اور شعوری ہوتے ہیں، مگر ان کے نتائج وہ
نہیں ہوتے ہیں جن کی خواہش کیجاتی ہے، یا جن کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے، بلکہ اعمالِ انسانی
اکثر اوقات ایسے نتائج پر منتہی ہوتے ہیں، جو پیشِ نظر مقصد یا متوقعہ نتائج کے خلاف ہوتے ہیں،
اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تاریخی واقعات میں بھی اتفاقات و حوادث کی حکمرانی ہے، لیکن
خواہ سطح پر اتفاقات حکمران نظر آئیں، واقعہ یہ ہے، کہ تاریخ انسانی چند قوانین مستورہ کے مطابق
حرکت کرتی ہے، اب یہ کام انسان کا ہے، کہ وہ ان قوانین کا انکشاف کرے،

کیا فکری غیر جانبداری اور بے لاگ ذہن کا وجود ممکن ہے

مارکسیت بڑے شد و مد سے اس خیال کی تردید کرتی ہے، کہ انسان کسی معاملہ
میں بالکل غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اختیار کر سکتا ہے، اس کا دعوی ہے کہ
فکر کا کامل توازن غیر ممکن ہے، چنانچہ پروفیسر داس گپتا اپنی کتاب (Materialism, Marxism, Determinism and Dialectics) میں لکھتے ہیں،
بے لاگ فکر کا قدیم نظریہ اور یہ خیال کہ انسان ذہن خالص کے ذریعہ کسی شے کی تحقیق و جستجو

کر سکتا ہے، بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہو کہ ہر تحقیق و جستجو میں محقق اور جستجو کنندہ ایک متاثرہ ذہن کے ساتھ
کام شروع کرتا ہے، یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :-
ہیزن برگ (Heisenberg) نے اپنے اصول لاتعین[1] (Principle of Indeterminacy) میں ثابت کر دیا ہے، کہ تفتیش و تحقیق کے عمل میں مفتش کاملاً غیر جانبدار
نہیں رہ سکتا ہے، بلکہ اس کا ذہنی نقطۂ نظر اپنا اثر ضرور رکھتا ہے، اس حقیقت سے فرار غیر ممکن ہے،
جوہری عالم (Atomic world) میں تحقیق اور محقق کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن
ہے، کہ معاشرتی علوم میں صحیح نہ ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ مفتش عمل تفتیش پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے، لیکن
اس مداخل ذات کے معنی یہ نہیں کہ مفتش اپنے ذاتی میلان یا پہلے سے قائم کردہ نظریات کے مطابق
کام کرنا شروع کرے، بلکہ اس سے مراد مفتش کی علمی اور ثقافتی روایات ہیں، جس میں وہ پرورش پاتا ہے،

(باقی)

---

[1] سائنسدانوں نے مادہ کے حقیر ترین ذرات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا، کہ جوہر (Atom)
منفی و مثبت برقیوں پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں الکٹرون (Electron) اور پروٹون
(Proton) کہا جاتا ہے، الکٹرون پروٹون کے اطراف گردش کرتے ہیں، ہیزن برگ نے
یہ معلوم کیا، الکٹرون کی گردش کا کوئی اصول نہیں ہوتا ہے، یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ الکٹرون
اپنی گردش میں کیا راستہ اختیار کریں گے، ہر الکٹرون چند معینہ دائروں (Orbits)
میں گردش کرتا ہے، لیکن ہیزن برگ نے بتایا کہ اکثر اوقات الکٹرون ایک دائرہ سے نکلنے کے بعد
بیچ کے دائروں کو چھوڑ کر اگلے دائرہ میں گردش کرنے لگتا ہے، اس طرح الکٹرون کی حرکت اور گردش
کے متعلق کوئی اصول نہیں بنایا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، یہی اصول لاتعین ہے،

اردو زبان کا غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی ادب

از

جناب مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"اردو کے عام اور مشترک زبان ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہو کہ ہندوستان کے تمام فرقون اور اہلِ مذاہب نے اسی کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی مذہبی و اخلاقی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا اس مین اپنی مذہبی کتابون کے ترجمے کئے، اور مذہب و اخلاق کے ہر پہلو پر بہ کثرت کتابین لکھین، بودھ، عیسائی، جین، سناتن دھرم، آریہ، سکھ وغیرہ کوئی ایسا فرقہ نہین ہے، جس کی مذہبی و اخلاقی کتابین، اردو مین موجود نہ ہون ہمارے پرانے رفیق مولوی محمد عزیر صاحب نے اس موضوع پر مذکورۂ بالا عنوان سے ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا ایک ٹکڑا ہمارے پاس اشاعت کے لئے بھیجا ہے، یہ مقالہ اردو کے مشترک اور عام مقبول زبان ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے، اور اس لائق ہے کہ اردو کے مخالفین اس کو غور سے پڑھین اور دیکھین کہ خود ہندوستان کے مذاہب اپنی تبلیغ مین کہان تک اردو کے رہین منت رہے ہین اور ان کا کتنا لٹریچر اردو مین موجود ہے"

"م"

ہندوستان مین مسلمانون کی آمد سے سیکڑون برس پہلے اس ملک سے عربون کے تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے، وہ ہندوستان کی پیداوار مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے رہے، اور وہان کا سامان، ہندوستان، جزائرِ ہند، چین، اور جاپان تک لیجاتے تھے، عربون کے علاوہ ہندوستان

اور مغربی ممالک کی تجارت مین ایرانیون نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی، ساتوین صدی عیسوی کے شروع مین جب مسلمانون نے ایران فتح کیا، تو مسلمان تاجر ایران کی بحری تجارت پر بھی قابض ہو گئے، اور عرب جہازرانون کے بیڑے بحرِ ہند مین روان نظر آنے لگے،

ہندوستان مین مسلمانون کے آنے کی ابتدا محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے خیال کیجاتی ہے، جو پہلی صدی ہجری کے آخر مین ہوئی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند مین مسلمانون کی نوآبادیان قائم ہوئین، اور سب سے پہلے وہ تاجرانہ حیثیت سے جنوبی ہند کے جزائر، اور بعض ساحلی مقامات پر آکر آباد ہوئے، سندھ پر حملہ کے مختلف اسباب تھے، ان مین سے ایک خاص سبب خود اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہو کہ جنوبی ہند کے اطراف مین مسلمان پہلے سے آباد تھے، پہلی صدی ہجری کے آخر مین حجاج عراق کا گورنر تھا، اور جزائر ہند کی طرف عراق کی بندرگاہ سے جہاز آتے تھے، لنکا کے راجہ نے مسلمانون سے اظہارِ دوستی کے طور پر منجملہ دوسرے تحائف کے ایک جہاز مین اُن مسلمانون کے اہل و عیال کو بھی عراق روانہ کیا، جو لنکا مین تجارت کے سلسلہ سے آباد تھے، اور وہین انتقال کر گئے تھے، اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ لنکا مین مسلمانون کی آبادی پہلی صدی ہجری مین قائم ہو چکی تھی، جس جہاز پر یہ تحائف اور مسلمانون کی عورتین اور بچے جا رہے تھے، اس پر سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب بحری ڈاکوؤن نے حملہ کر کے تمام سامان اور اُن عورتون اور بچون پر قبضہ کر لیا، حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو اوس نے سندھ کے راجہ داہر سے ان گرفتارون کو بحفاظت عراق بھجوا دینے کا مطالبہ کیا، مگر راجہ نے یہ عذر کیا کہ ڈاکوؤن پر میرا کچھ زور نہین، حجاج نے اس عذر کو قبول کیا، اور اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی مین ایک فوج سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی، جس نے ۹۳ھ مین سندھ پہنچ کر تین برس کے عرصہ مین ملتان سے کچھ تک اور دوسری طرف مالوہ کی سرحد تک قبضہ کر لیا،

لنکا مین مسلمانون کی آمد کا سلسلہ تجارت کے علاوہ ایک مذہبی عقیدت کی بنا پر بھی شروع ہوا،

وہان کے ایک پہاڑ پر ایک نشانِ قدم تھا، جسے مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کے قدم کا نشان سمجھتے تھے، اور اُس کی زیارت کو آیا کرتے تھے، انہی کے ذریعہ سے لنکا کے راجہ کو اسلام کا حال معلوم ہوا، اور ذر شتہ کی روایت کے مطابق ۵۰ھ ہجری یعنی ساتوین صدی عیسوی ہی مین مسلمان ہوگیا، بزرگ بن شہر یار نے بھی اپنی کتاب عجائب الہند مین جو ۳۰۰ھ کے قریب کی تصنیف ہے، مسلمانون کے ساتھ لنکا والون کے تحبت اور میلان رکھنے کا ذکر کیا ہے[۱]

ان اطراف مین مسلمانون کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا، مالدیپ کے مفصل حالات ابن بطوطہ نے لکھے ہین، اُس کے زمانہ یعنی سلطان محمد تغلق کے عہد مین پورا جزیرہ مسلمان تھا، اور اس مین عربون اور دیسی مسلمانون کی آبادی تھی، اور سلطان خدیجہ نام ایک بنگالی خاتون وہان کی فرمانروا تھی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہان کے لوگ پہلے بت پرست تھے، لیکن مراکو کے ایک شیخ ابو البرکات بربری مغربی کی ایک کرامت دیکھ کر راجہ شنورزاہ اور اُس کی تمام رعایا مسلمان ہوگئی، وہ لکھتا ہے کہ مالدیپ کی اس مسجد کی محراب پر جسے نومسلم راجا نے تعمیر کرایا تھا، مین نے یہ کتبہ دیکھا:-

"سلطان احمد شنورازہ ابو البرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا"[۲]

قریب قریب اسی زمانہ مین مسلمانون کی ایک جماعت نے عرب سے آکر ملیبار کے ساحل پر بود و باش اختیار کی، رونلڈسن (RONALDSON) تحفۃ المجاہدین کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ "مسلم عرب ساحل ملیبار پر اوّل اوّل ساتوین صدی عیسوی کے آخر کے قریب آباد ہوئے" اسٹروک (STURROCK) کا بیان ہے کہ "یہ بخوبی معلوم ہو کہ ساتوین صدی کے بعد سے ایرانی اور عرب تاجر ہندوستان کی مختلف بندرگاہون مین کثرت سے آباد ہوگئے، اور اس علاقہ کی عورتون سے شادی کرلی، اور یہ آبادیان خصوصیت کے ساتھ ملیبار مین بڑی، اور اہم تھین، جہان بہت قدیم زمانہ سے

[۱] عرب وہند کے تعلقات:- از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۶۲ [۲] ایضاً ص ۶۵-۲۶۴

یہ پالیسی نظر آتی ہے، کہ بندرگاہون مین تاجرون کی ہر طرح حوصلہ افزائی کیجائے"[۱] ملیبار مین مسلمانون کی آمد اور اشاعت اسلام کے تفصیلی حالات شیخ زین الدین نے اپنی مشہور کتاب تحفۃ المجاہدین[۲] مین لکھے ہین، جو ملیبار کے مسلمانون کی سب سے قدیم تاریخ ہے، وہان کے راجہ چیرامن پیرومال کے قبولِ اسلام کا واقعہ جس طرح اس کتاب مین بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے روایتی حیثیت رکھتا ہو، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ "ملیبار مین چیرامن پیرومال کا خاندان نوین صدی عیسوی کے شروع ہی مین اُس کے آخری فرمانروا کی تخت سے دست برداری کے ساتھ ختم ہوگیا تھا، جو غالباً مسلمان ہوگیا تھا، چنانچہ راجہ کے مسلمان ہونے کی یادگار ملیبار مین اب تک اس طرح منائی جاتی ہے، کہ تخت نشینی کے وقت ٹراونکور کے راجہ زمورن (سامری) کو مسلمانون کا سا لباس پہنایا جاتا ہے، اور ایک مسلمان ماپلا اُس کے سر پر تاج رکھتا ہے، پھر راجہ کو تلوار ہاتھ مین لے کر یہ کہنا پڑتا ہے، کہ "مین یہ تلوار اس وقت تک رکھونگا، جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ہے، واپس نہین آتا"، کہا جاتا ہے کہ زمورن اُس راجہ کا جو عرب چلا گیا تھا، نائب ہے، ان مراسم کے بعد راجہ ذات باہر سمجھا جاتا ہے، اور نائر یا اعلیٰ طبقہ کے ہندو اُسے ہاتھ نہین لگاتے،

مسلمانون نے شروع ہی سے ملیبار مین ہر دلعزیزی اور اہمیت حاصل کرلی تھی، وہ ماپلا کے نام سے پکارے جاتے تھے، جس کے معنی ہین بزرگ کا بچہ یا دولھا، یہ لقب ملیبار مین عیسائیون کو بھی دیا گیا تھا، مگر دونون فرقون مین امتیاز کی غرض سے عیسائیون کو نصرانی ماپلا کہتے تھے، مسلمانون کو اور مراعات بھی حاصل تھین، مثلاً ایک مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا، حالانکہ ایک نائر کو اس کی اجازت نہ تھی، اسی طرح ماپلا کے سردار تھنگل کو زمورن (سامری) کے ساتھ ساتھ پالکی مین جانے

[۱] ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر (انگریزی) از ڈاکٹر تاراچند، مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، ص ۳۲،

[۲] تحفۃ المجاہدین مترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڈھ،

کی اجازت تھی، زموری کی سرپرستی مین عرب تاجرون کی ایک بڑی تعداد اوس کے علاقون مین آباد ہوگئی، اور انھون نے اپنی تجارت سے نہ صرف ملک کی دولت مین بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ راجہ کی فوجی مہمون مین بھی اس کی مدد کی، زمورن مسلمانون کی نسبت ایسی اچھی راے رکھتا تھا کہ اوس نے اپنی ہندو رعایا مین اسلام پھیلانے کی حوصلہ افزائی کی، اور چونکہ ہندو جہاز رانی سے مذہبًا اجتناب کرتے تھے، یہ حکم دیا کہ ماہی گیرون کے ہر خاندان مین سے کم سے کم ایک لڑکے کو مسلمانون کی سی تعلیم و تربیت دیجائے تاکہ عرب جہاز رانون کے لئے جن پر وہ اپنی جارحانہ مہمون مین بھروسا کرتا تھا، سپاہی تیار ہوسکین، ان مراعات اور حوصلہ افزائیون کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا اثر روز بروز بڑھتا گیا، اور مسلمان بڑی تعداد مین جنوبی ہند مین آباد ہوگئے،

مغربی ساحل کی طرح مشرقی ساحل پر بھی، عربون کی آمد و رفت تجارت کے سلسلہ سے زمانۂ قبل اسلام سے تھی، عرب تاجر چین جاتے ہوئے خلیج بنگال سے گذرتے تھے، مسلمان عربون نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور ساحلی مقامات پر اُن کی آبادیان بڑھتی گئین، تجارتی جہاز اس کثرت سے یہان سے آتے جاتے تھے، کہ عربون نے اس ساحل کا نام ہی معبر (گذرگاہ) رکھدیا، ملیبار کی طرح معبر کے مسلمانون کو بھی مقامی راجاؤن کی طرف سے ہر قسم کی رعایتین ملین، اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے،

مسلمانون اور ہندو راجاؤن کے تعلقات کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ۷۱۰ھ (۱۳۱۰ء) مین جب سلطان علاؤالدین کی فوج نے کارومنڈل پر حملہ کیا، تو اس کے راجہ کی طرف سے مسلمان عراقیون اور مسلمان عربون نے مسلمان ترکون کا مقابلہ کیا اور گو راجہ کو شکست ہوئی، اور ملک کافور نے ملک پر قبضہ کرلیا، لیکن کارومنڈل کے مسلمان اپنے عہد و پیمان کی بنا پر اور رعایتون کی حق شناسی مین جو انھین راجہ کی طرف سے حاصل تھین، مسلمان حملہ آورون سے نہایت جانبازی کے ساتھ لڑتے

کی روایت کے مطابق محض کلمہ اور قرآن پڑھ کر اور اس طرح اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیکر اور امیر خسرو ملک کافور کے شدید انتقام سے اپنی جان بچا سکے،[۱]

چودہوین صدی عیسوی مین ملک کافور کے حملہ کے بعد جب ابن بطوطہ نے معبر کا سفر کیا، تو جس علاقہ مین اب میسور کی ریاست ہے، وہان اس وقت ہوسیالا خاندان کی حکومت تھی، اور پایۂ تخت کا نام دوار سمندر تھا، حکمران راجہ بلال دیو تھا، ابن بطوطہ نے اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے، جس مین بیس ہزار کے قریب مسلمان تھے،[۲]

ڈاکٹر تاراچند اپنے ایک مقالہ مین لکھتے ہین:-

ان بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ہی دنون بعد مسلمانون نے ہندوستان مین اپنی تہذیب، مذہب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کرلیا، ساتوین صدی سے بارہوین صدی تک ان کا تعلق تجارت کی صورت مین تھا، اور سوداگرون کی حیثیت سے شروع مین اُن کی آؤ بھگت ہوئی، جب ہندو راجہ اُن سے واقف ہوگئے، تو اُن کی وقعت اور بھی بڑھ گئی، وہ بڑے بڑے عہدون پر مقرر ہوئے، اُن مین سے وزیر بیڑون کے کمانڈر، ایلچی، افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ہونے لگے، اُن کو اپنے مذہب کی پابندی کے لئے مسجدین بنانے، اور اپنے مذہبی پیشواؤن، اور فقیرون کو خانقاہون مین رکھنے کی اجازت تھی، صرف یہی نہین، بلکہ وہ کھلم کھلا اپنے مذہب کی تبلیغ کرسکتے تھے، اور کہین کہین تو راجہ خود اس تبلیغ مین مدد کرتے تھے؛ اور صرف جنوبی ہند تک اس پُرامن اثر کے حدود نہ تھے، بلکہ شمالی ہندوستان مین بھی مسلمانون کا ہندوؤن سے بہت دنون تک اسی طرح کا تعلق رہا، یہ سچ ہے کہ آٹھوین صدی کے اوائل مین عربون نے سندھ پر قبضہ کرلیا، لیکن ملتان اور سندھ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضہ مین نہین آیا،[۳]

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات" ص ۷، ۵، ۲، ۲ [۲] ایضاً ص ۳۰۰ [۳] مسلمانون کا ہندوستان مین آنا، از ڈاکٹر تاراچند (مطبوعہ رسالہ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء)

گجرات کاٹھیاوار، کچھ، اور کوکن کا علاقہ عربون کا پانچوان تجارتی مرکز تھا، ان علاقون مین بھی مسلمان بڑی تعداد مین آباد ہوگئے تھے، اور انھون نے اتنی عزت اور اہمیت حاصل کرلی تھی، کہ ان کے باہمی معاملات کو طے کرنے کے لئے راجہ انہی مین سے کسی معزز آدمی کو . . . ہنرمند مقرر کر دیتا تھا، ہنرمند کے لفظی معنی تو ہنر والے کے ہین، لیکن اصطلاح مین اُس مسلمان قاضی کو کہتے تھے، جو راجہ کی طرف سے مسلمانون کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ مختلف بڑے بڑے شہرون مین ہنرمند مقرر تھے، عرب سوداگرون نے اکثر یہین کی عورتون سے نکاح کر لیا تھا، اُن سے جو اولاد ہوتی تھی اُن کو بیسر (بیاسرہ جمع) کہتے تھے،

شمالی ہند مین مسلمانون کا قدم سب سے پہلے سندھ مین آیا، جیسا کہ شروع مین بیان ہوا، محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری کے آخر مین دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس حملہ سے پہلے ہی، پانچ سو عرب مسلمانون کی ایک جماعت مکران سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کے یہان چلی آئی تھی، اور لنکا کے مسلمان تاجرون کی یتیم لڑکیون کے علاوہ ان پناہ گزینون کو واپس نہ کرنا بھی منجملہ ان اسباب کے تھا، جو حجاج کی اس انتقامی مہم کا باعث ہوئی، بہرحال عربون نے سندھ اور ملتان پر قبضہ کرکے ان ریاستون کو اسلامی سلطنت کا باج گذار علاقہ بنالیا، لیکن یہان اُن کا بڑھتا ہوا قدم رک گیا اور آیندہ تین صدیون تک اُن کی حکومت ہندوستان کے اسی گوشہ تک محدود رہی،

مسلمانون نے ہندوستان مین آکر اس ملک کو اپنا وطن بنالیا، جنوبی ہند مین تو اُن کی آمد تاجرانہ تھی، لیکن شمالی ہند مین بھی جہان وہ فاتحانہ حیثیت سے آئے تھے، فاتح اور مفتوح کی مغائرت صرف تھوڑے دنون تک قائم رہی، اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونون ہمسایون کی طرح رہنے لگے، اور امتداد زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے لگے، ایک جگہ رہنے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دونون ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے، اور اس طرح ایک نئی تہذیب وجود مین آئی، جس کو ہندوستانی

تہذیب کہہ سکتے ہین، جو نہ خالص اسلامی تھی، نہ بالکل ہندو، اس مشترک تہذیب کے ظہور مین آنے کی خاص وجہ یہ بھی تھی، کہ ہندوستان کے مسلمانون کی ایک بڑی تعداد نو مسلمون کی تھی، انھون نے باہر سے آنے والون کا مذہب تو اختیار کر لیا تھا، مگر تہذیب و تمدن مین بہت کچھ اپنی قدیم روایات کے پابند تھے، یہ اشتراک تہذیب کے مختلف پہلوؤن مین نمودار ہوتا گیا، چنانچہ مذہب، ادب، علوم و فنون، تعمیر و موسیقی، ہر ایک مین ملکی و غیر ملکی عناصر کا امتزاج عمل مین آنے لگا، جنوب مین اسلامی تعلیمات سے جو اثر براہ راست پڑا، اس کے علاوہ ایک بالواسطہ اثر ہندوؤن پر یہ بھی ہوا کہ اُن کے دلون مین مذہبی احساس از سر نو پیدا ہوگیا، اور اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند مین بھگتی کی تحریک جسے رامانج نے تکمیل کو پہنچایا اور ویدانت کی تحریک جو شنکراچاریہ کے ہاتھون پایۂ کمال کو پہنچی، ایک حد تک اُس عام مذہبی بیداری کا نتیجہ تھی، جو اسلام کے اثر سے پیدا ہوگئی تھی، چودھوین صدی عیسوی کے بعد مہاراشٹر، گجرات، پنجاب اور بنگال کے مصلحین مذہب اپنے چند قدیم عقائد کو ترک کرکے اسلام کی بعض تعلیمات قبول کر لیتے ہین اور اس طرح دونون مذہبون کی آمیزش سے ایک نیا مذہب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہین، چنانچہ کبیر داس اور گرونانک کی تعلیمات مین اسلامی تعلیمات کا اثر صاف ظاہر ہے،

ایسی ہی تبدیلی ادب کے میدان مین نظر آتی ہے، ہندوستان کا علمی سرمایہ عوام کی ضروریات کے لئے سنسکرت سے منتقل ہوکر ہندی، مرہٹی، اور بنگالی مین آجاتا ہے، اور ہندو اور مسلمان دونون ان زبانون کے ادب کو فروغ دینے مین حصہ لیتے ہین، علم و ادب کا یہی اشتراک ایک نئی زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنجاتا ہے، مسلمان اپنی عربی، فارسی، اور ترکی چھوڑ کر اس ملک کے باشندون کی زبان اختیار کر لیتے ہین، اور اس طرح ایک مشترک زبان وجود مین آتی ہے، یہ زبان ہندو مسلمانون کے صدیون کے میل جول کا نتیجہ تھی، دونون نے اس کو اپنا مشترک سرمایہ سمجھا، اور اسے ترقی دینے مین یکسان کوشش کرتے رہے،

مسلمانون نے جب ہندوستان مین قدم رکھا، تو یہ ملک سیکڑون چھوٹی چھوٹی مملکتون اور ریاستون
مین بٹا ہوا تھا، جو باہم برسر پیکار رہا کرتی تھین، زبان کے لحاظ سے بھی تفریق و انتشار کا یہی عالم تھا، ہر
ریاست کی زبان الگ تھی، اور لڑائیون مین کسی ریاست کے حدود کے بڑھنے یا گھٹنے کے ساتھ اس کی
زبان کا دائرہ بھی بڑا یا چھوٹا ہوتا رہتا تھا، مسلمانون کی آمد سے جس طرح اس ملک مین سیاسی وحدت پیدا
ہوئی، اسی طرح لسانی وحدت کا سامان بھی فراہم ہوا، یہان مسلمان بادشاہون کی دفتری زبان
تو فارسی تھی، لیکن عام بول چال کے لئے جسے ہندو مسلمان دونون سمجھتے، یہ زبان کام نہین دے سکتی
تھی، اور نہ یہ ممکن تھا، کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو تمام ملک مین جاری کر دیا جائے، نتیجہ یہ
ہوا کہ مسلمان جس صوبہ مین گئے، وہان کی زبان اختیار کر کے مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور
علمی ضرورتون سے اپنی زبان کے سیکڑون الفاظ اس مین داخل کر دیئے، اور چونکہ یہ الفاظ ضرورت
کی بنا پر داخل کئے گئے تھے، اس لئے اس زبان کا جزبن کر مقبول عام ہو گئے، اس طرح ایک مخلوط
زبان کا پیکر تیار ہوا، جو سندھ مین سندھی، گجرات مین گجراتی، دکن مین دکنی، پنجاب مین پنجابی، اور
دہلی مین دہلوی کہلائی، دہلی کی یہی زبان اپنے ارتقاء کی منزلین طے کرتی ہوئی جب شاہجہان کے
اردوے معلی مین پہونچی تو زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی، موجودہ اردو دراصل دہلی اور اطراف دہلی
کی پرانی ہندی ہے، جس مین زمانہ کے تقاضے سے تبدیلیان رونما ہو گئین، اور جو عربی، فارسی
اور ترکی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی شکل مین ظاہر ہوئی، اس زبان کے فعل اور حرف سب
دہلوی ہندی کے ہین، اسماء مین البتہ نصف دہلوی ہندی کے ہین، اور باقی عربی، فارسی، اور ترکی
ہین، یا کچھ پرتگالی، اور انگریزی الفاظ ہین، یہ بیرونی اسماء وہ ہین، جن کے مسمی اکثر باہر سے آئے تھے
مسلمانون نے جو الفاظ اور مصطلحات صوبون کی زبانون مین داخل کئے، ان کی ایک طویل اور دلچسپ فہرست
مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تحقیقی مقالہ "ہندوستان مین ہندوستانی" مین دی ہے،[۱]

[۱] مطبوعہ "نقوش سلیمانی" ص ۲۶۔۳۰،

اس مشترک زبان کی تشکیل مین مسلمان درویشون اور صوفیون نے بڑا حصہ لیا، وہ مسلمان تاجرون
اور سپاہیون کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، اور ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات
سے کم وسیع نہ تھا، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہین، "اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک
کو غزنین اور غور کے بادشاہون نے فتح کیا، تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی
روح کو خانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا" صوفیہ چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے
ہین، اور تزکیہ نفس ہی ان کی سرگرمیون کا مقصود ہوتا ہے، اس لئے ان کے دروازے کافر و مومن دونون
کے لئے یکسان طور پر کھلے رہتے ہین، انسانی ہمدردی خلوص و محبت ان کے اصلی جوہر ہین، اور یہی چیزین
ان کی روحانی فتوحات کی ضامن ہوتی ہین، ہندوستان مین جو درویش آئے ان کا حلقہ اثر بھی انہی چیزون
کی وجہ سے روز بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا، ان کا سابقہ چونکہ بیشتر عوام سے تھا، اس لئے دلون کو ہاتھ
مین لانے کے لئے ہم زبانی ضروری تھی، چنانچہ اپنے خیالات کی تلقین کے لئے وہ ملک کے جس حصہ مین پہنچے
وہان کی زبان اختیار کر لی، اور عوام کو انہی کی زبان مین تعلیم دی، لیکن چونکہ بعض مذہبی اصطلاحون کا
استعمال ناگزیر تھا، اور یہ عربی یا فارسی مین ہوتی تھین، اس لئے عربی اور فارسی الفاظ بھی ان بولیون
مین قدرتی طور پر شامل ہو گئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "ہندوستان مین ہندوستانی" اور
مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے رسالہ "اردو کی ابتدائی نشو و نما مین صوفیائے کرام کا کام" مین دکھایا ہے
کہ اس مشترک زبان کے پیدا کرنے مین حضرات صوفیہ کا حصہ کتنا زیادہ ہے، اب تک اس مخلوط زبان
کے جتنے قدیم فقرے ملے ہین، یا جو قدیم کتابین دستیاب ہوئی ہین، خواہ دکھنی زبان مین ہون یا گجراتی
مین، سب حضرات صوفیہ کے ملفوظات یا انہی کی تصنیفات ہین،

یہ خیال صحیح نہین کہ ہندوستان کی یہ مشترک زبان صرف مسلمانون کی زبان ہے، اس
زبان کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس نظریہ کی تردید کے لئے کافی ہے، غیر مسلمون بالخصوص

ہندؤن نے اس زبان کی تشکیل، ترقی، اور اشاعت مین جتنا زیادہ حصّہ لیا ہے، اس کا بیان ایک مستقل تالیف چاہتا ہے، پیشِ نظر مقالہ مین صرف ان کتابون کا ذکر کیا گیا ہے، جو غیر مسلمون نے اپنے مذاہب اور مذہبی اخلاق سے متعلق اردو مین لکھ کر شائع کی ہین، ایسی کتابون کی تعداد کئی سو ہے، انڈیا آفس کے کیٹلاگ مین جس مین صرف انیسوین صدی کے آخر تک کی کتابین درج ہین، ان کی تعداد (۱۳۰۰) ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانون کی فہرستون مین بھی ایسی کتابون کی کثیر تعداد ملتی ہے، مجھے پٹنہ، صوبہ جات متحدہ، دہلی اور لاہور کے پندرہ سولہ کتب خانون کی سیر مین اردو کی کم وبیش چارسو غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی کتابون کے دیکھنے، اور اُن کی یادداشتین قلمبند کرنے کا موقع ملا، ان مین سے بعض کے اقتباسات اس مقالہ مین درج کئے گئے ہین، ان اقتباسات سے مختلف غیر اسلامی مذاہب کی تعلیمات بھی معلوم ہوتی ہین، اور اس مشترک زبان کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہین، جو اس ملک کے رہنے والون کے صدیون کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، اگر یہ زبان صرف مسلمانون کی ہوتی، تو غیر مسلم خصوصًا ہندو اپنی مذہبی کتابین اس کثرت سے اس مین کیون شائع کرتے، ہندو، عیسائی، سکھ، جین اور بہائی مذہب، اور ہندؤن کے متعدد اصلاحی فرقے مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج، رادھا سوامی مت، تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ، ان سب کا اپنے مذہب واخلاق کی نہ صرف مستند اور چوٹی کی کتابون کو اردو مین ترجمہ کرکے شائع کرنا، بلکہ سیکڑون چھوٹی بڑی کتابون کو ترجمہ اور تالیف کرکے اردو کے ذریعہ عوام تک پہنچانا اس حقیقت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہو کہ یہ مشترک زبان ہندوستان کے بڑے حصّہ کی عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے، غیر اسلامی مذاہب کی یہ سیکڑون کتابین اردو مین اُن لوگون کے لئے نہین شائع کی گئی ہین، جو نہ ان مذاہب سے تعلق رکھتے ہین، اور نہ اُردو جن کی مادری زبان ہے، اس زبان کے ہندوستان کی عام زبان ہونے کا اعتراف خود ہندؤن کی مذہبی کتابون کے بعض مصنفین نے بھی کیا ہے، مثلاً لالہ لاجپت رائے مشہور آریہ لیڈر، اپنی کتاب "مہاراج سری کرشن، اور اُن کی تعلیم" (مطبوعہ ہندوستانی برقی پریس لاہور ۱۹۰۰ء) کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"اُردو حقیقت مین ہندوستانیون کی زبان کا نام ہے، بلکہ اکثر موقعون پر اُردو اور ہندوستانی ایک ہی معنون مین مستعمل ہوتے ہین،"

پنڈت جنیشور پرشاد مائل دہلوی نے "حُسن اوّل"[1] کے نام سے ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، جس مین جین، بودھ، اور ہندو مذہب کے فلسفہ، اخلاق، ادب اور علوم وفنون کا گلدستہ نہایت پاکیزہ زبان مین پیش کیا ہے، اُس کے دیباچہ مین فرماتے ہین :-

"جب سے سرکار انگلشیہ کی حکومت ہم پر ہوئی، اور عدالتی دفاتر کی زبان اردو ٹھہری تو اس کی کچھ قدر ہوئی، لوگون کے شوق اور خیالات نئے نئے پہلو بدلنے لگے، اور رفتہ رفتہ تہذیب پھیلی، اور ہماری رفتار وگفتار کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف نے بھی انگریزیت کا جامہ پہننا شروع کیا، چنانچہ تھوڑے عرصہ مین وہ نمایان ترقی کرلی کہ آج اُردو زبان بچے سے جوان ہوگئی، اگرچہ اردو کا جنم خاص دلّی مین ہوا، اور اوس نے اسی خطہ مین پرورش پائی، مگر تھوڑی سی مدت مین اتنی بڑھی چڑھی کہ تمام ہندوستان کی زبان یہی ہوگئی، بلکہ اردو سے ہندوستانی زبان کہلانے لگی،......... مین اگرچہ ناثر نہین ہون، ناظم نہین ہون، انگریزی مجھے بالکل نہین آتی، دنیا کی اور بہت سی زبانون سے بے بہرہ ہون، علوم فنون مین بھی کچھ دستگاہ نہین رکھتا، سنسکرت اور فارسی مین بھی اپنے آپ کو کسی قابل نہین سمجھتا، ہان اردو میری مادری زبان ہے، اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا ایک سعادتمند اولاد کی طرح میرا فرض ہے، لہذا باین ہیچمدانی ہمت کرتا ہون، اُور

---

[1] مطبوعہ انڈین پریس، الٰہ آباد،

چاہتا ہون کہ پرانے رشیون اور مہاتماؤن کے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر لاؤن، اُن سے اردو کا ایوان سجاؤن، اب اس مین برکت دینا اور میری محنت کو ٹھکانے لگانا اسی کا کام ہے،

ورنہ من آنم کہ من دانم،

کسے بخاک نگند و کسے نواخت مرا — بقدرِ ہمتِ خود ہر کسے شناخت مرا"

یہ صحیح ہے کہ ہندوؤن کی مذہبی کتابون مین جو اردو مین لکھی گئی ہین، سنسکرت اصطلاحات بھی بکثرت ملتی ہین، یہ بالکل ایک فطری امر ہے، جس طرح مسلمان صوفیہ کو اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے دیسی بولیون مین عربی اور فارسی کی مصطلحات ضرورۃً داخل کرنی پڑین، اُسی طرح ہندوؤن نے بھی جب اپنے مذہب و اخلاق کا خزانہ اس ملکی زبان (اردو) مین منتقل کرنا شروع کیا تو اُن کو بھی سنسکرت مصطلحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہ تھا، لالہ لاجپت رائے نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب کے دیباچہ مین اس مجبوری کو بہت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہین :-

"اصل تو یہ ہے کہ ہندو خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے ہندی الفاظ کا استعمال لازمی ہے، (دیکھو مولانا مولوی الطاف حسین حالی کی مناجاتِ بیوہ) بلکہ بعض استاد تو اصل اردو اُسی کو کہتے ہین جس مین فارسی و اردو کے الفاظ نہایت کم ہون، یا بالکل نہ ہون، اردو مین سے فارسی کے الفاظ نکال دیے جائین، تو خالص ہندی رہ جاتی ہے، صرف اتنا فرق ہے، کہ جو الفاظ ہندی کے معمولی طور پر مستعمل نہین وہ مسلمان صاحبان کو بُرے معلوم ہوتے ہین، اور وہ اُن کو اردو نہین کہتے، مگر جو لفظ معمولی طور پر مستعمل ہین، وہ اُن کو اُردو سمجھتے ہین، بہرحال جو ہندو اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے ایسی کتابین لکھتے ہین، جن مین اُن کے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کا تذکرہ ہوتا ہے، اُن مین ہندی یا سنسکرت کے الفاظ بیجا یا نامناسب نہین، کس طرح سے ممکن ہے کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہوا

کرشن و ارجن و یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ اُردوے مُعلّی مین کرے، اور خاص مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی و عربی کی فرہنگ تلاش کرے، ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے، فارسی و عربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے، پس وجوہاتِ بالا سے ہمارے خیال مین ہماری زبان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، وہ ہمارے نزدیک کچھ بہت منزلت نہین رکھتا، ......"

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اپنے مذہبی یا قومی خیالات یا حالات کے تذکرہ کی غرض سے ہندوؤن نے "اپنے ہم قوم بھائیون کے لئے" اسی مشترک زبان مین کتابین لکھی ہین، گو ان کتابون کی عبارتون مین ہندی یا سنسکرت کے جو الفاظ آئے ہین، وہ "بیجا یا نامناسب نہین" البتہ لالہ لاجپت رائے کا یہ ارشاد کہ "کس طرح ممکن ہے، کہ کوئی ہندو ہندوؤن کے لئے کتاب لکھتا ہوا کرشن وارجن و یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ اردوے معلّی مین کرے اور خاص مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی وعربی کی فرہنگ تلاش کرے،" نیز یہ کہ "ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی و عربی کے لفظون کا استعمال تو بہت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے،" محلِ نظر ہے بعض ہندو مترجمین نے کرشن ارجن اور یدھشٹر کی تقریرون کا ترجمہ بھی اردوے معلّی مین کیا ہے، مشکل مذہبی خیالات کے لئے فارسی و عربی کی فرہنگ بھی تلاش کی ہے، اور ہندو عورتون کی تقریرون کا ترجمہ کرتے ہوئے فارسی و عربی الفاظ بھی استعمال کئے ہین، جو ذرا بھی بُرے نہین معلوم ہوتے، چند مثالین ملاحظہ ہون :-

شریمد بھگوت گیتا کا سب سے قدیم ترجمہ جو مجھے دستیاب ہوا، منشی کنھیالال عرف الکھ دھاری کا ہے، اس اردو ترجمہ کا نام گیان پرکاش ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۳ء مین گیان پریس آگرہ مین چھپا تھا، اس مین سے چوتھی ادھیا کے چند اشلوک حسب ذیل ہین :-

سری کرشن کہتے ہین :- "اے ارجن کرم جوگ یعنی تہذیب اخلاق عمدہ چیز ہے، اور یہی

لازوال ہے، مین نے سب سے پہلے یہ علم آفتاب کو سکھایا تھا، اور آفتاب نے بیوست مُن کو اور اس مُنی نے اچھواک کو، اس علم کے جاننے سے راجے نضیلت پاتے ہین، کیونکہ درویش صفت ہو جاتے ہین لیکن انقلاب سے زمانہ کے یہ علم معدوم ہو گیا ہے، یہ جوگ قدیم اور نہایت شریف ہے، تجھے اپنا عزیز سمجھ کے بتاتا ہون، ارجن نے کہا:۔ اے کرشن تم اب پیدا ہوئے ہو اور آفتاب مدت مدید کو گزرا، پس مین کیونکر باور کرون کہ تم نے یہ علم آفتاب کو سکھایا، کرشن نے جواب دیا:۔ اے ارجن مین اور تو قدیم ہین، لیکن اس کی حقیقت تو نہین جانتا ہے، مین جانتا ہون، مین وہ ہون جس کا نہ کوئی باپ ہے، اور نہ کوئی بیٹا، اور صاحب تمام عالم کا ہے، مگر طبیعت سے تناسخ مین پھنسا ہون، جب اخلاقِ حمیدہ گم ہو جاتے ہین، اور شر و فساد زیادہ ہو جاتا ہے تو اعتدال دینے کو ایک صورت پیدا ہوتی ہے، مین وہ صورت ہون واسطے مدد دینے نیکون کے اور استیصال بدون کے اور قائم کرنے بنیاد عقل کے اور اکھاڑنے دیوار ظلم کے مین پیدا ہوا ہون، تا کہ آیندہ کوئی اپنی حد سے باہر پاؤن نہ دھرے، اور افراط و تفریط ہونے نہ پاوے، .....'' (ص ۵۷-۵۸)

پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ فلسفۂ الوہیت کے نام سے کیا ہے، اس کے پہلے ادھیا مین ارجن کی تقریر جو اس نے کروکشیتر کے میدان مین کرشن کے سامنے کی تھی، اس طرح نقل کی ہے :-

"ارجن نے باپ دادا، گرو، مامون، بھائی، بیٹے، پوتے، دوست، خُسر اور پیارون کو جو طرفین کی فوج مین اس موقع پر موجود تھے، دیکھا، اور ان سب یگانون کو موجود دیکھ کر وہ پسر کنتی اُن کی غایت الفت کے سبب غمگین ہو کر کہنے لگا، اے کرشن ان اقربا کو جو جنگ پر آمادہ ہین، دیکھ کر میرے عضو سست ہوئے جاتے ہین، منہ خشک ہوتا ہے، بدن کانپتا اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہین، کمان ہاتھ سے گری پڑتی ہے، خون جوش کھاتا ہے، کھڑا نہین رہا جاتا، اور دل بے قرار ہے، کرشن مجھے آثار مخالفت نظر آتے ہین، اور یگانون کو جنگ مین مار کر کوئی فائدہ نہین دیکھتا، کرشن مین فتح سلطنت اور عیش و آرام کی تمنا نہین دیکھتا، اے گوبند ہمارے نزدیک سلطنت، لذاتِ دنیا، اور حیات ہیچ ہین، جن کے لیے ہم نے سلطنت اور عیش و آرام چاہا تھا، وہ تو جان اور مال سے ہاتھ دھو کر اس معرکہ جنگ مین کھڑے ہین یہان پر گرو، باپ بیٹے اور دادا، مامون خسر، پوتے، سالے اور قرابت مند موجود ہین اے کرشن! ہر چند وہ مجھے قتل کر ڈالین مین روے زمین کے بلکہ ترلوکی کے راج کی طمع سے بھی ان کا قتل روا نہین رکھتا، دھرت راشٹر کی اولاد کو مار کر ہمین راحت تو کیا حاصل ہو گی، ان بدکردارون کو مار کر ہم بھی آلودۂ گناہ ہون گے، پس ہم کو دھرت راشٹر کی اولاد کو جو اپنے عزیز ہین، قتل کرنا لازم نہین ....

.... اگر

مقابلہ کئے بغیر مجھ نہتے کو دھرت راشٹر کے بیٹے جن کے ہاتھون مین ہتھیار موجود ہین، مار ڈالین، تو میرے حق مین خوب ہو، یہ کہکر ارجن نے تیر اور کمان ڈال دیئے، اور وہ رنج سے پریشان ہو کر میدانِ جنگ مین رتھ کے اندر بیٹھ گیا؛ (ص ۳۲، ۳۷)

دوسری ادھیا مین سری کرشن کی تقریر ہے، جو انھون نے ارجن کے جواب مین کی :-

"اے ارجن، تجھ کو یہ بے دلی میدانِ جنگ مین کہان سے پیدا ہوئی، جو کہ بزرگون کی شان سے بعید اور باعثِ بدنامی ہے، اور جس کا انجام اچھا نہین، ارجن، مخنث کا طریقہ اختیار نہ کر کہ یہ امر تیرے لئے زیبا نہین ہے، اے فاتح دشمنان، پست ہمتی، اور بزدلی کو چھوڑ کر کھڑا ہو" (ص ۳۸-۳۹)

بھگوت گیتا کے انیس ترجمے نظم و نثر مین ہندوؤن کے کئے ہوئے مین نے دیکھے ہین،

ان میں سے دو ایک کا اقتباس نمونتہً اور پیش کرتا ہوں، "غذاے روح" کے نام سے پنڈت پربھو دیال معر عاشق لکھنوی نے جو منظوم ترجمہ کیا ہے، اس میں ارجن کے اس سوال کا،

کرم یوگی کون ہو بتلایئے اے خوشخصال / اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسا ہو کیسی بول چال

سری کرشن یہ جواب دیتے ہیں :-

جو دکھی دکھ سے نہ ہو سکھ سے نہ ہو جس کو خوشی / جس نے چھوڑا خوف و غصہ چاہ عارف ہو وہی

جس کو ساری باتیں اچھی یا بری ہیں ایک سی / جو برائی یا بھلائی سے نہ ہو نالاں نہ شاد

جس کو حاصل ہو گئی، اس دہر میں اتنی سمجھ / چاہئے کہنا اُسے یکسوئی سے ہے بامراد

جس طرح لیتا ہے کچھوا اپنے اعضا کو سکوڑ / پھر یکسوئی یونہی منہ نفس سے لیتے ہیں موڑ

ہو گیا پرماتما کا گیان جس کو دہر میں / اس کی فکر و نفس دونوں خودی زائل ہو گئے

خواہشوں کو زیر کرنے کی اگر کوشش کریں / تو بھی جبراً مضطرب کرتی ہیں دل کو خواہشیں

اس لئے قابو میں رکھنا خواہشوں کو لازمی / ہو گئیں گر خواہشیں قابو میں یکسوئی ہوئی

نسیم عرفان کے عنوان سے گیتا کا ایک اور منظوم ترجمہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کیا ہے، اس کی زبان اپنی روانی صفائی اور فصاحت کے لحاظ سے قابلِ داد ہے، ملاحظہ ہو،

ساتواں ادھیاے

علم معرفت یعنی گیان و گیان کی تعلیم

بھگوان ہیں محو خوش بیانی / فرماتے ہیں آپ گل فشانی

اے پارتھ، دل اپنا مجھ کو دیکر / زیر دامن پناہ لے کر

شغل ہیم سے جوگ کے پاک / تم جیسے کرو گے مجھ کو ادراک

۱؎ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء ص ۱۸، ۲؎ مطبوعہ کارونیشن پرنٹنگ ورکس، دہلی،

اب حال سنو بغور اس کا / کیا ڈھنگ ہے کیا ہے طور اس کا

وہ راز نہاں عیاں کروں گا / تفصیل اس کی بیان کروں گا

علم مطلق ہے علم جس کا / امر برحق ہے علم جس کا

واقف اُس سے بشر جو ہو جائے / اک بار اُس پر نظر جو جائے

پھر کوئی نہیں ہے امر ایسا / رہ جائے جو آگہی سے تشنا

ہونے کو تو لاتعد بشر ہیں، / ایسے انسان کم مگر ہیں،

ہے کسب کمال کام جن کا / ہے شغل یہی مدام جن کا

دُھن کے پکے جو مرد شاغل / کر لیتے ہیں منزلت یہ حاصل

اُن میں بھی ہیں ایسے چند انسان / جن کو مرا واقعی ہے عرفان

مٹی اور اُس کے بعد پانی / پھر آگ کا پردہ نہانی

عالم بعد اُس کے ہے ہوا کا / پھر کرۂ محیط ہے خلا کا

پھر ہیں دل و عقل سلسلہ وار / اُن کے آگے ہے سترِ پندار

ہیں یہ آٹھوں صفات میری / محجوب ہے اُن سے ذاتِ میری

ارجن جو کرو گے ان پہ تم غور / ادنیٰ انھیں پاؤ گے بہر طور

پر میری صفت اک اور بھی ہے / حاصل جسے خاص برتری ہے

بالاتر ہے مقام جس کا / مشہور ہے روح نام جس کا

جو وجہ قیام دو جہان ہے / جو اصل نظام دو جہان ہے

یہ امر ہے جاننے کے قابل / یہ بات ہے ماننے کے قابل

ہوتی ہیں جب صفات یکجا / پڑتی ہے بنائے نظم دنیا

ہین یہ ہر وقت برسرِ کار ہستی ہے تمام انھیں سے بیدار
امکاں مجھی سے ہے بقا کا مین ہی مختار ہون فنا کا
یہ امر ہے طے شدہ دِ جنجے مجھ سے بڑھ کر نہین کوئی شَے
کچھ بھی میرے سوا نہین ہے مین ایک ہوں دوسرا نہین ہے
جس طرح سے ہار مین گندھے ہون موتی اک تار مین گندھے ہون
اسباب جہان ہین نظم مجھ مین یہ کون و مکان ہین نظم مجھ مین
خورشید مین نور ماہ مین تاب ہون اے ارجن مین لذت آب
ہون زیدہ روز گار مین ہی دیدون مین ہون اونکار[له] مین ہی
مین ہی آواز ہون خلا مین میرا ہی ظہور ہے صدا مین
مردون میں ہون مردمی کا جوہر "تابندہ مجھی سے ہے یہ گوہر" (۸-۷-۱۰)

(باقی)

له اسم اعظم،

میری محسن کتابین

دوسرے دور کے رسالہ الندوہ نے ملک کے مشاہیر اصحاب علم و کمال سے ان کتابون کے نام دریافت کئے تھے، جن کا ان کی ذہنی تعمیر اور تشکیل سیرت مین خاص حصہ رہا ہے، اس کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، وہ الندوہ مین میری محسن کتابون کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، اور بعد مین ان کو کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا تھا، اس مین نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولینا عبید اللہ سندھی وغیرہ ہندوستان کے بہت سے اکابر اور اصحاب علم کے مضامین ہین جن سے عربی فارسی اور انگریزی کی بہت سی اہم کتابون کی خصوصیات اور متفرق معلومات حاصل ہوتی ہین قیمت عہ، پچاس سے زیادہ نسخون کے خریدارون کو معقول کمیشن دیا جائیگا، دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے،

"منیجر"

برمک اور پُرمکھ

از

سید سلیمان ندوی

پچھلے معارف مین البرامکہ کے مصنف مولوی عبد الرزاق صاحب مرحوم کی وفات کا حال لکھا ہے، اس سلسلہ مین خیال آیا، کہ "عرب و ہند کے تعلقات" مین مین نے برمکی خاندان کو مذہبًا بودھ اور اُن کے لقب برمک کو سنسکرت سے ماخوذ اور ان کے عبادتگاہ نوبہار کو مجوسی معبد کے بجائے بودھ خانقاہ ثابت کیا تھا، جس کی اصل "نوا وبیار" ہے، مرحوم نے البرامکہ کے اخیر اڈیشن مین جو اضافے کئے ہین، ان کا اچھا خاصہ حصہ میرے ان تینون نظریون کی تردید مین ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ اُن کی ان تازہ تحقیقات پر تنقید کرون، مگر ردّ و قدح سے دل کو اب اتنا بعد ہوگیا ہے، کہ جی نہ چاہا، دار المصنفین کے بعض رفیقون سے خواہش کی، کہ وہ اس کا جواب دین، مگر وہ پرایا بوجھ کیون اپنے سر اُٹھاتے،

ان تینون دعوون کے جو دلائل میری کتاب مین ہین، وہ اب بھی بالکل اپنی جگہ پر قائم ہین، مرحوم نے جو کچھ اُن کے رد مین لکھا ہے، وہ تمامتر مفروضات ہین، چنانچہ اس وقت ایک خاص تعلق سے اس فرسودہ موضوع پر چند سطرون کے لکھنے کا خیال آیا،

۱۔ **برمک**: اس لفظ کو مین نے سنسکرت بتایا تھا، جس کے معنی رئیس کے ہین، لیکن اس لفظ کی پوری توجیہ نہین کی تھی، میرے فاضل عزیز مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی نے جب میری اس کتاب کو پڑھا، تو چونکہ وہ گجرات مین کافی رہ چکے ہین، اور اب بھی وہی ہین، ان کی نظر اس لفظ کی اصلیت پر

نو بہار پڑ گئی، اور پنسل سے اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ اصل لفظ پرمکھ ہے، یہ نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ مین موجود ہے، اب ایک لائق شاستری سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ پرمکھ پر اور مکھ سے بنا ہے، مکھ کے معنی منہ کے ہین اور پر ایک سابقہ ہے، جو بعض لفظون کے شروع مین بڑھا دیتے ہین، جس سے معنی مین تغیر ہو جاتا ہے، مکھ کے پہلے پر لگانے سے صدر اور رئیس کے معنی ہون گے، چنانچہ ہندوستانی ریاستون کی جو نئی تنظیم ہوئی ہے، اس سلسلہ مین گجرات اور بھرت پور کی متحدہ ریاستون کا صدر اعلیٰ کا نام بھی پرمکھ رکھا گیا ہے،

۲- نوبہار کا نوا وبہار ہونا تو اتنا کھلا ہے، کہ اس پر کچھ دوبارہ لکھنا تحصیل حاصل ہے، نوبہار کو فارسی موسم بہار سے منسوب کرنا، سراسر لفظ پر کھیلنا ہے، اور فیلالوجی کا مذاق اڑانا ہے،

۳- اس دعوی کے ثبوت مین کہ نوبہار بودھ معبد تھا، مجوسی نہین، میری کتاب مین بہت سے دلائل ہین، مرحوم مؤلف البرامکہ نے اُن کے مقابلہ مین اپنے سابقہ دعوی کے اعادہ مین کہ یہ مجوسی معبد تھا، اپنی کتاب کے نئے اڈیشن مین بہت سی تاریخی عبارتین نقل کی ہین، جو خود میری کتاب مین ہین، لیکن اس طول نضول سے کوئی فائدہ نہین، صرف یہ دیکھنا کافی تھا، کہ ان تاریخی وجغرافی کتابون مین اس معبد کے اندر آگ کا ہونا مذکور ہے، یا مورتون کا، اگر اس کے اندر آگ کا ثبوت ہو تو وہ بے شبہہ آتشکدہ تھا، اور اگر مورتون کا ذکر ہو تو وہ بودھ کا معبد تھا، بس اتنی سی بات پر سارا فیصلہ ہے، جن صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو وہ میرے اور ان کے دلائل پر غور کرین، حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی،

تصوّفِ اسلام

(طبع جدید)

مدیر صدق مولانا دریابادی کی مشہور کتاب تصوفِ اسلام کا نیا اڈیشن تیار ہو گیا ہے جس مین بتایا گیا ہے کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے، اور اس مین اور موجودہ رواجی تصوف مین کتنا فرق ہے، اس نئے اڈیشن کے لئے پوری کتاب کے مضامین پر نظر کر کے کتاب کو بالکل نئی حیثیت دیدی گئی ہے قیمت:- عہ "منیجر"

ادبیات

گاندھی

از جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

وہ حدیثِ روح پیامِ جان، جسے ہم نے سن کے بھلا دیا
وہ حریمِ غیب کا ارمغان، جسے پا کے ہم نے گنوا دیا

وہی ملک و ملتِ جان بلب، جسے اس نے آب بقا دیا
اسی ناسپاس نے ہائے اب اُسے جامِ مرگ پلا دیا

ہمین جس نے فتح دلائی تھی اُسی خاک و خون میں ملا دیا
ہمین جس نے راہ دکھائی تھی، اسے راستے سے ہٹا دیا

اسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دستِ شفا دیا
جو گرے تھے اُن کو اٹھا دیا، جو مرے تھے اُن کو جلا دیا

جو اٹھا تھا شعلۂ شور و شر، اسے اپنے خون سے بجھا دیا
جو پڑا تھا پردہ نگاہون پر اُسے آپ اٹھ کے اٹھا دیا

وہ خمیدہ قد خمِ ماہ تو وہ نظر فروز خنک سی ضو
وہ نگاہ، برقِ عمل کی رو کہ دلون کو جس نے ہلا دیا

وہ فروغ بخش ہر انجمن کہ زمانے بھر مین تھا ضو فگن
وہ چراغِ بزم گہِ وطن، کسی تیرہ دل نے بجھا دیا

وہ کتابِ صلح کا سر ورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق
وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بدھ اور کرشن کا جانشین ہمہ تن عمل ہمہ تن یقین
وہ تبسمِ سحر آفرین کہ چمن لبون سے کھلا دیا

وہ برنگ آئینہ صاف دل، وہ فروغِ فطرتِ آب و گل
کہ جہادِ نفس نے مستقل اسے اور حسن جلا دیا

وہ جلالِ شیوۂ سادگی، وہ جمالِ صورتِ زندگی
وہ زلالِ چشمۂ آگہی کہ زمانے بھر کو جگا دیا

وہ شرارہ برقِ حیات کا، وہ ستارہ راہِ نجات کا
وہ منارہ عزم و ثبات کا جسے فتنہ ساز نے ڈھا دیا

اثر اس کا اب ہو وسیع تر کہ ہر ایک دل میں ہے اس کا گھر
یہ سمجھ کے خوش نہ ہون فتنہ گر کہ اسے پیام فنا دیا

تری شان کون گھٹا سکے اسے خود خدا نے بڑھا دیا
کہ تجھے بقائے دوام دی تجھے منصبِ شہدا دیا

تری خامشی وہ زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا
تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ کبر ہلا دیا

وطنِ عزیز کو شان دی اُسے قیدِ غم سے چھڑا دیا
وہ اتحاد میں جان دی جو کہا وہ کر کے دکھا دیا

جنھیں زیر کر نسکا ستم، ہوے صید سلسلۂ کرم
تری نیکیوں نے تری قسم سرِ خود سری کو جھکا دیا

یہ عروس کشورِ ہند تھی، ہمہ بیکسی ہمہ بیدلی
اسے تونے غازۂ خرمی، تری خون نے رنگِ حنا دیا

تجھے مندروں نے صدائیں دین کہ تری کرم امان ملی
تجھے مسجدوں نے دعائیں دین کہ تباہیوں سے بچا دیا

یہ کمالِ پیروی علی، یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمنِ جان کو بھی وہی ارمغان بنا دیا

تجھے بیکسی نے سپاہ دی تجھے مشکلات نے راہ دی
تجھے بجلیوں نے پناہ دی، تجھے تخیوں نے مزا دیا

یہی دھرم ہے یہی اصلِ دین کہ ہو قول سچ تو عمل حسین
حق و اہلِ حق یہ رہے یقین یہ پیام سب کو سنا دیا

ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی تری تن کو پھول بنا دیا

ترا فیض دہر میں عام ہو یہ غبار اُٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

خود آگہی

از جناب اکرام لدھیانوی

گذر گئے جو خرد سے وہی ہیں فرزانے!
یقین کے راز کو عقل و شعور کیا جانے

کسے خبر کہ وہ کیا تھا جمالِ آتشناک
سلگ رہے ہیں ابھی تک دلوں کے کاشانے

ہر ایک رنگ کو خالی ہے جلوہ گاہِ وجود!
تری نظر نے تراشے ہیں یہ صنمخانے!

یہ کس طریق پہ ہوتا ہے اہتمامِ بہار!
شکستہ جام و سبو ہیں، اداس میخانے

غمِ حیات نے چھوڑا تھا نا تمام جنھیں
تری نظر سے مکمل ہوئے وہ افسانے

رہی نہ گرمیٔ رنگِ حیات محفل میں
خموش شمع ہے، اور جل چکے ہیں پروانے

نہ بیخودی نہ شعورِ خود آگہی اکرام
شرابِ شوق سے خالی ہیں تیرے پیمانے

مطبوعات جدیدہ

مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ (انگریزی) مؤلفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، تقطیع متوسط ضخامت ۳۵۰ صفحات قیمت معلوم نہیں، ملنے کا پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری دروازہ لاہور،

کسی کتاب کو ڈاکٹر حمید اللہ کی تالیف بتانا اس کی تعریف کے لئے کافی ہے، جن لوگوں نے ان کی تالیفات پڑھی ہیں، وہ ان کے مطالعہ کی گہرائی، وسعت، نکتہ رسی، قوتِ استدلال، صحت استنباط، اور متانتِ بیان کے معترف ہوں گے، زیرِ نظر کتاب انگریزی زبان میں انہی کی تصنیف ہے، اس کتاب کا موضوع مسلمان بادشاہوں کا ..... آئین معاملتِ اقوام ہے، اس کی تالیف میں مؤلف نے جس وسیع مطالعہ سے کام لیا ہے، اس کا اندازہ اس فہرستِ کتب سے ملتا ہے، جو آخر کتاب میں درج ہے، اس کی معلومات فراہم کرنے کے لئے مؤلف نے ہندوستانی ذخائر علم ہی پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ مختلف ممالکِ اسلامیہ کے علاوہ فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کے ذخائر کا بھی جائزہ لیا ع

تمتع ز ہر گوشۂ یافتند

اس کتاب کو مؤلف نے چار ابواب پر تقسیم کیا ہے، اصل کتاب، ۲۹۰ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد دو ضمیمے ہیں، پہلے ضمیمہ میں حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور خلفاے بنو عباس کے چند فرامین ہیں، دوسرے ضمیمہ میں ان عربی، اردو، فارسی، اور ترکی تالیفات پر مختصر تبصرے ہیں جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ہے،

پہلے باب تعارف کو مؤلف نے گیارہ فصلون مین تقسیم کیا ہے، ابتدائی سات فصلون مین بین الاقوامی قانون کی حقیقت، عام قوانین کے درمیان اس کا مقام، اسلامی آئین معاملت اقوام کے موضوع، غرض، اساس اور سرچشمون سے بحث کی ہے، آٹھوین فصل مین یہ دکھایا ہے کہ انسانی معاشرہ کو بین الاقوامی بنانے مین اسلام نے کیا حصہ لیا، نوین فصل مین بین الاقوامی قانون کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی ہے، خلاصہ حسب ذیل ہے،

دنیا کی معلوم تاریخ دوآبہ، دجلہ و فرات کے سمیری تمدن سے شروع ہوتی ہے، اس کے بعد مصر، شام، قرطاجنہ، یونان اور روما مین، تہذیب و تمدن نے عروج پایا، بین الاقوامی رابطہ کی قدیم ترین دستاویز جو ہم کو دستیاب ہو سکی ہے، فرعون مصر رعمیس دوم (۱۲۹۲–۱۲۲۵ ق م) اور ایک حتی بادشاہ کا معاہدہ امن و صلح ہے، جس نے ایک مستقل جنگ کا خاتمہ کر کے، پرامن تجارتی اور سیاسی اختلاط کی بنیاد رکھی، اس دستاویز کے بعد قدامت مین عبرانی لٹریچر کا درجہ ہے، عبرانی قوم جنگ کی حالت مین نہایت سخت گیر تھی، اس کے آئین جنگ مین نہ صرف سور ماؤن کا قتل کرنا روا تھا، بلکہ دشمن کے بچون بوڑھون اور عورتون تک کو فنا کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، یونانیون نے بین الاقوامی قوانین کی ایک حد تک بنیاد رکھی، مگر ان کے آئین مین جزائر یونان کی شہری حکومتون کے سوا، تمام غیر یونانی اقوام کو وحشی خیال کیا جاتا تھا، ارسطو کا فلسفہ یہ تھا کہ یہ تمام وحشی لوگ غلامی کے لئے مخلوق ہوئے ہین، افلاطون نے اپنی قوم کو آپس کے تعلقات مین آشتی اور مدارات کا مشورہ دیا ہے، لیکن اس کے خیال مین کبھی یہ بات نہ آئی، کہ غیر اقوام بھی بادوستان تلطف با دشمنان مدارا کی حقدار ہین، رومنون نے یونان سے بہتر آئین، اور بین الاقوامی نوعیت کا بنایا، جس کی رو سے ان کے حلیف اور ماتحت ملک کے افراد کو روما مین قانونی تحفظ حاصل تھا، لیکن جس ریاست کا روما کے ساتھ کوئی دوستانہ معاہدہ نہ ہو اس کے افراد کی جان مال، اور آبرو درون قلمرو مین محفوظ نہ تھی،

ظہور اسلام کے وقت عرب کا کچھ حصہ روما کی مشرقی حکومت کے زیر اثر تھا، کچھ ایران کے ماتحت تھا، آزاد عرب متعدد خود مختار قومون مین بٹا ہوا تھا، بین الاقوامی قانون کے ارتقاء کے لئے متعدد خود مختار سیاسی وحدتون کا وجود لازم ہوا ہے، یہ چیز عربون کو قدیم سے میسر تھی، جس کی بدولت عربون نے بھی چند دستور ایسے رائج کر رکھے تھے، جن کو معاملت اقوام کے آئین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے، اشہر حرم کی تقدیس، ایلاف، عہود، سفارت و منافرت کا دستور، ایلچیون کے خون کی تحریم، معاہدون کی تعظیم، پناہ گیر کو پناہ دینے کا رواج، اور حلف الفضول، ایام جاہلیت کے مستحسن آئینون مین داخل تھے،

دسوین فصل مین مصنف نے بتایا ہے، کہ بین الاقوامی دستورون کی تاریخ مین اسلام کا مقام کیا ہے، اور گیارھوین فصل مین اسلامی آئین کی اخلاقی اساس بتا کر پہلے باب کو ختم کر دیا ہے، اس کے بعد امن و صلح، جنگ و کشاکش اور مجانبت و ناطرفداری کے ان ضوابط پر سیر حاصل بحث کی ہے، جن پر مسلمان سلاطین عموماً کاربند رہا کئے ہین، کتاب مین بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر یہ کتاب کسی یورپین نے لکھی ہوتی، اور موضوع بحث مسلمانون کا نہین، بلکہ کسی آریا قوم کا آئین ہوتا، تو اس کتاب کے ربع سے کم مضمون کو نہایت خوش آیند اور دلکش اطناب کے ساتھ اس کتاب کے چوگنے صفحات مین لکھا گیا ہوتا، مگر ڈاکٹر صاحب نے قدماے سلف کے ایجاز کو عہد جدید کے مداحانہ اطناب پر ترجیح دی ہے،

یہ موضوع ایسا ہے جس مین اختلاف رائے کی گنجایش ہے مگر اس مین شبہہ نہین کہ بالعموم مصنف کی رائین صحیح ہین، مسلمانون کے بین الاقوامی آئین پر یہ پہلی کتاب ہے، جو اس زمانہ کی ضرورتون کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، تنگ و محدود نسلی اور جغرافی قومیت کی پیدا کردہ عالمگیر کشمکش کی وجہ سے اب دنیا کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہ وسعت صرف اسلام ہی مین مل سکتی ہے، اس لئے اسلام کے بین الاقوامی قوانین کو پیش کرنا ایک بڑی مفید خدمت ہے،

"ا-ح"

"اقبال بحیثیت مفکر کے" (انگریزی) ضخامت ۳۰۰ صفحات، قیمت ھر، پتہ شیخ محمد اشرف

کشمیری گیٹ، لاہور،

اقبال کے بعض فلسفیانہ تصورات، مثلاً نظریہ زمان و مکان، خودی کا پس منظر اور وجود مطلق پر ہندوستان کے مختلف اصحاب علم و قلم نے انگریزی میں جو مضامین لکھے ہیں، اُن کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب حیدرآباد دکن، پروفیسر ایم ایم اشرف علی گڈھ، خواجہ غلام السیدین صاحب اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، جن سے اقبال کے فلسفہ کے بنیادی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن کتاب چونکہ ایک ہی شخص کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ مختلف اصحاب علم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس لئے بعض مقامات پر تضاد پیدا ہو گیا ہے، مثلاً وجود مطلق کے بارے میں پروفیسر ایم ایم شریف صاحب نے اقبال کے نظریہ کو جس قدر وضاحت اور عمق کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لائق تحسین ہے، لیکن کتاب کے آخری مضمون سے پروفیسر صاحب موصوف کے بعض نظریات کی تردید ہوتی ہے، اگر وجود مطلق کے بارہ میں ان کی تشریح صحیح ہے، اور قطعی صحیح ہے، تو پھر کتاب کا آخری مضمون جو کسی اور صاحب کا لکھا ہوا ہے، بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے،

لیکن ایسی کتاب میں جو مختلف الخیال اصحاب قلم کی کوششوں کا نتیجہ ہو، یہ تضاد چنداں تعجب انگیز نہیں، تاہم پبلشر کو چاہئے تھا، کہ اس قسم کی کتاب میں صرف ایسے مضامین شائع کئے جائیں، جو ایک دوسرے کو سمجھنے میں معاون اور ان کے موید ہوں، نہ کہ ان میں تضاد پایا جائے، غلام السیدین صاحب کا مضمون جدتِ خیال کا حامل ہے، اس میں ان تمام اعتراضات کا جواب خوش اسلوبی کے ساتھ دیا گیا ہے، جو اقبال پر تعصب اور کج فہمی کی وجہ سے کئے جاتے ہیں، مجموعی حیثیت سے اقبال کے فلسفہ پر یہ اچھی کتاب ہے،

ابنِ مسکویہ (انگریزی) از جناب خلیفہ عبدالحامد صاحب ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت عیر

پتہ:۔ شیخ محمد اشرف کشمیری گیٹ لاہور،

ابن مسکویہ ممتاز مسلمان حکما میں ہے، لیکن عام طور پر اس کی شہرت ایک مورخ اور فلسفہ اخلاق کے معلم کی حیثیت سے ہے، اور اسلامی فلسفہ پر یورپین زبانوں میں اب تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں ابن مسکویہ کے اصلی فلسفہ کا پورا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، بعض مغربی مصنفین مثلاً ڈی بوئر (De Boer) نے تو اس قدر اختصار سے کام لیا ہے، کہ یہی سمجھ میں نہیں آتا، کہ تاریخ فلسفہ اسلام کے ذیل میں اس کا ذکر کیونکر کیا جا سکتا ہے، البتہ سر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب (Metaphysics in Persia) میں نسبتہً تفصیل سے کام لیا ہے، مگر بعض مقامات پر وہ بھی محض اشارات کر کے گذر گئے ہیں، اس لحاظ سے خلیفہ عبدالحامد صاحب کی یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے، اس میں ابن مسکویہ کے فلسفہ کے تین پہلوؤں، اثبات وجود مطلق، روح اور نبوت پر جن کی وضاحت ابن مسکویہ نے اپنی کتاب میں کی ہے، روشنی ڈالی گئی ہے، اور فاضل مصنف نے اس کی پوری کوشش کی ہے، کہ وہ ابن مسکویہ کے فلسفہ کو استدلال اور ہمواری کے ساتھ پیش کر دیں، اور اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، مگر بعض مسائل ایسے ہیں کہ جن کو شاید ابن مسکویہ بھی پورے طور سے حل نہیں کر سکا ہے، اور نہ اس کے شارح عبدالحامد صاحب ہی اس کتاب میں اس کو سلجھا سکے ہیں، مثلاً اثبات وجود مطلق کے ذیل میں حرکت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی (جو ان دلائل سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں) وجود مطلق کا اثبات کیونکر کیا جا سکتا ہے، یا روح کا وجود بھی ان دلائل سے ثابت نہیں ہوتا، جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، تاہم فاضل مصنف نے ابن مسکویہ کے بنیادی دلائل کو حتی الامکان پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کتاب اس حیثیت سے بہت قابل قدر ہے، کہ ابن مسکویہ کے فلسفہ پر اب تک اتنا بھی کسی نے نہیں لکھا ہے، اور اسلامی فلسفہ سے ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

"ع – ا"

گلپس آف اسلام، مؤلفہ پرنس آغا خان، ڈاکٹر ذکی علی، تقطیع چھوٹی حجم ۱۲۰ صفحے،

قیمت ہر، ملنے کا پتہ: شاہ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

یہ انگریزی مین مشہور صاحب قلم ڈاکٹر ذکی علی کا مضمون ہے، جس مین انھون نے دکھایا ہے، کہ اسلام کو جو لوگ علوم کی ترقی مین حائل بتاتے ہین، وہ غلطی پر ہین، جس کا یورپ کے منصف مزاج مصنفون اور محققون نے اعتراف کیا ہے، آٹھوین صدی مسیحی سے تیرہوین صدی مسیحی تک علوم و فنون کے تنہا علمبردار مسلمان تھے، مسلمانون کی علمی خدمات خصوصاً فن طب مین اُن کے کمال پر مؤلف نے تاریخی شہادتین پیش کی ہین، یہی مضمون کتاب کی جان ہے، کتاب تین فصلون پر مشتمل ہے، پہلی فصل کی سرخی "اسلام کے اصول" ہے، یہ فصل آغا خان کی لکھی ہوئی ہے، اس مین انھون نے اپنی اسماعیلیت کا اعلان کرتے ہوے لکھا ہے، "گو مین اس بحث مین نہ تو اپنا خاص مسلک پیش کرنا چاہتا ہون، اور نہ سنی یا شیعی مسلک، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ مغربی قارئین کے سامنے اس وسیع سرچشمہ کو پیش کردون جس کا منبع مدرسہ غزالی کے خیالات ہین" دوسری فصل ڈاکٹر ذکی علی کی لکھی ہوئی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی، تیسری فصل بھی آغا خان ہی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر ان کے نام کے نیچے ڈاکٹر ذکی علی کا نام بھی ہے، اس فصل مین باطنی مسلک کے اس عقیدہ کو دہراتے ہوے کہ قرآن کا ایک باطنی مفہوم بھی ہوتا ہے، سنیون کے مسلک اجماع کی طرف اشارہ کیا ہے، اور مسلمانون کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ ازہر مین تمام فرق اسلامیہ کے مجتہدون کا اجتماع کرکے نئے سرے سے ایک نئے اجماع کی بنیاد ڈالین، مشورہ تو خوب ہے مگر اس مشورہ اور فصل اوّل کے مضمون کا فصل سوم کی بحث سے کوئی جوڑ نہین، مقدمہ مین مولفین نے لکھا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کی جب از سرِ نو تنظیم کی فکر ہوگی، اس وقت اسلامی اصول پر لوگون کو غور کرنے کا موقع ملے گا، اس سے خیال تھا، کہ اس کتاب مین اسلام کے ایسے اصول پیش کئے جائین گے، جن کی اس وقت دنیا کو ضرورت ہے، مگر ہمارا یہ خیال غلط نکلا، تاہم اس کتاب کی فصل دوم قابل قدر ہے،

جلد ۶۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۸ء عیسوی عدد ۵

مضامین